نئی شاعری کا شعری اسلوب اور افتخار جالب کی نظم

Iftikhar Jalib and Poetic Style of Modern Poetry

رضوانہ نقوی * مربازغہ قندیل **

Abstract:

Iftakhar jalib was a renowned literary figure of sixties who tried to set a new era of modern urdu poetry. He had an extensive peruse of modern philosophy, linguistic & art so, in the light of his spacious perusal he try to change the traditional perspective of urdu poetry specially urdu poem which was an excelling way of his disclosure. On the way of his literary & poetical struggle he set hyper-modernist trend in criticism & poetry called Liasni-Tashkeelat.Near 1958 he with other companions based a new poetical movement named ' Naie Shairi ki Tahreek' many notable poets like Jeelani Kamran, Anees Nagi, Abbas Athar, Zahid DAR, Saleem-ur Rahman, Abdul Rasheed, Aftab Iqbal Shamim, Saadat Saeed joined him in the struggle of literary innovation & enriched the lap of urdu poetry with oner jems of art. Iftakhar Jalib's Lisani Tashkeelat are nodes to follow and expostulate for common readers & critics therefore he & his art faced a potent criticism by accustomed poets & critics. His poetic asset hasn't aesthetics sense in traditional way but demands highly literate reader for its comprehension which was nearly impossible at a broad so this Movement & Lesani Tashkeelat couldn't prevail in common way. In this article I have tried to adumbrate his art & its dynamics and also tried to delineate the true

*لیکچرار، جی اے سی ڈبلیو، جلال پور شریف

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

reason of his literary abortiveness.

Key words: New poetry, leesani tashkeelat, traditional, insurrection, obliqueness, originality, undefiled poetic style.

اردو شاعری کی تاریخ میں ''نئی شاعری'' کے نام سے شہرت پانے والی تحریک افتخار جالب کی کاوشوں کا ثمر تھی۔ اس تحریک کے ردّ و قبول کی ہنگامہ آرائی میں سب سے زیادہ وار افتخار جالب نے ہی سہے ہیں اور ہر وار کا جواب شعری اور تنقیدی حوالے سے بھرپور طور پر دینے کی سعی بھی کی ہے۔ اسی بنا پر نئی شاعری کی لسانی تشکیلات اور افتخار جالب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ لسانی تشکیلات کی نظریہ سازی میں ان کا کلیدی کردار رہا ہے۔ افتخار جالب نے نا صرف معاصر و ما قبل کے ملکی و غیر ملکی، ادبی و سماجی اثرات کے تحت لسانی تشکیلات کا نظریہ پیش کیا بلکہ اسے اپنے تخلیقی عمل سے جوازنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ لسانی تشکیلات کی جو صورت ان کے ہاں نظر آتی ہے اس تحریک سے وابستہ دیگر شعرا کے ہاں موجود نہیں۔ نئی شاعری کی لسانی تشکیلات ان کی فکر و تنقید سے تقویت پاتی ہیں، وہ 1960 کی دہائی کے سب سے بڑے نظریہ ساز شاعر تھے کہ جن کی نظم و نثر اردو شاعری کی روایت میں ہنگامہ آرا رہی۔ ان کا منتہا اک نئی شعری لغت کی زریعے اردو شاعری کی قلبِ ماہیت تھا جس کی سعی انہوں نے اپنی شعری اور تنقیدی تخلیقات کے زریعے کی ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ماخذ'' مطبوعہ 1963 اردو شاعری کی روایت سے بغاوت، اسلوبِ شعر سے انحراف بلکہ یک گونہ تصادم اور نئے شعری تجربات کے لئے نئے افق کھوجنے کی کوشش کے طور پر نمایاں ہے۔ پہلے شعری مجموعے سے شروع ہونے والا یہ سفر آخر تک مروجہ جذباتی و لسانی اسالیب کی مسماری میں مسلسل روایت و عدمِ روایت سے جوجتا نظر آتا ہے۔

لسانی تشکیلات وہ مخصوص ذریعہء اظہار تھا کہ جس میں لفظ ایک زندہ حقیقت تجربہ اور شے ہی نہیں بلکہ بیک وقت جزو اور کل کے خصائص بھی سمیٹے نظر آتا ہے۔ لسانی تشکیلات اظہار کی لا مرکزیت اور لا شعر کے ذریعے اردو نظم و شعر کو اس جدید شعری رویے سے آشنائی بخشتی ہیں جو جدید مغربی ادب میں تخلیقی جدت کے طور پر مروج تھا مگر اردو ادب و شاعری اس تخلیقی رویے سے دور جدّت کے نام پر محض روایت دہرا رہی تھی۔ نئے شعرا کا اسلوب، علامتی، تمثیلی، تجریدی اور تجرباتی خصائص سے مملو لسانی تشکیلات کے عمل میں تجرید و تجربہ کو ہیئت و موضوع پر فوقیت تفویض کرتے ہوئے لسانی اور شعری روایت کے انہدام پر اپنا الگ جہانِ فن تعمیر کرتا ہے۔ افتخار جالب کا لسانی تشکیلات کا نظریہ لفظوں کو شے کا درجہ عطا کر کے انہیں قائم بالذات حقیقت گردانتا ہے۔ جہاں اظہار کی لا مرکزیت، علامتی تمثیلی و استعاراتی اوصاف شعری عمل کا ناگزیر حصّہ بن کر ابھرتے ہیں۔ لسانی تشکیلات میں

زبان کا استعاراتی عمل قریب کے مماثلتی رشتوں کے برعکس بعید کے مماثلتی و مشابہتی رشتوں پر اپنا شعری جہان تعمیر کرتا ہے۔ جس سے تخلیق میں ابہام کی موجودگی ناگزیر ہو جاتی۔ ان کی نظمیں استعاراتی جسمیت کی ٹھوس مثال سامنے لاتی ہیں۔ جہاں استعاراتی طرزِ اظہار سے زبان میں ابھرنے والی ٹھوس جسمیت الفاظ کی معنوی حدود میں لامحدود وسعتوں کی امین ہے، جہاں الفاظ معنی کے دروازوں سے مماثل تربیت یافتہ قاری کے لیے حظ و علم کے بے بہا خزانوں کے در کھولتے ہیں اور قاری لفظی، معنوی و تلازماتی دروبست سے آشنائی کے بعد خود کو بحرِ معانی میں غوطہ زن محسوس کرتا ہے۔ لسانی تشکیلات میں استعارہ بیان کی شیئت سے متعلق ہونے کی بنا پر ٹھوس صوری تلازموں کو پیدا کرتا ہے۔ جس میں ہر ایک کا الگ معنوی جہان محوِ گردش محسوس ہوتا ہے۔ یوں استعارہ کی ٹھوسِ جسمیت لسانی جسمیت میں ڈھل کر زبان کی جزوی حیثیت کو کلی حیثیت میں ڈھال دیتی ہے۔ اس عمل میں زبان جزو کی بجائے خود ایک بڑے کل کی صورت میں متعدد اجزا کو خود میں سمیٹے محسوس ہوتی ہے جہاں ہر جزو خود اپنی ذات میں کل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ زبان کی یہی وسعت شعوری عمل میں ڈھل کر لسانی تشکیلات کی شناخت متعین کرتی ہے وہ لسانی تشکیلات جو ادب میں افتخار جالب کی شناخت بھی ہیں اور ایک متنازع ادبی قرینے کی اساس بھی۔ لسانی تشکیلات کے تحت فنکار مکمل آزادی کے ساتھ نا صرف مروجہ صرف و نحو کو چیلنج کرتا ہے بلکہ شعری تخلیق میں معنوی قرینوں کے نئے در بھی وا کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ شعری قرینوں کا انحصار مصرعوں کی صرفی و نحوی ترتیب کی بجائے نفسیاتی اور جذباتی اسلوب پر ہوتا ہے۔ چناچہ نئی شاعری میں لسانی تشکیلات کے تحت مروجہ لسانی سیاق و سباق کی شکست و ریخت نئے لسانی امتزاجات اور نئے لسانی اسلوب کی احتیاج تجربات کے ان منطقوں کا لازمی نتیجہ ہے جو نئی شاعری سے پہلے اردو شعرا کے لیے بے معنی تھے۔

افتخار جالب کے ناقد ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے لسانی تشکیلات کے نظریے سے نا صرف اپنی شہرت کو نقصان پہنچایا بلکہ ان شعرا کو بھی گمراہ کیا کہ جو ان کے ساتھ چلے، کیونکہ اپنے دورِ آخر میں وہ اس لسانی نظریے سے تائب ہو گئے تھے. اس بات میں صداقت موجود نہیں کیونکہ انہوں نے لسانی تشکیلات کی تردید کسی دور میں بھی نہیں کی اس کا ثبوت " یہی ہے میرا لحن" کی نظمیں ہیں۔ جن میں لسانی شیوہ و شعری اظہار دونوں اسی انفرادیت کا نمونہ ہیں جو افتخار جالب کی لسانی تشکیلات کا خاصا ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے بقول: حبیب جالب کی رفاقت کے زیر اثر انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ اگر بات عوام تک پہنچانا اور جمہور کی بیداری منظور ہے تو بات عام فہم انداز میں پیش کی جانی چاہیئے۔ لیکن سادہ اندازِ تخاطب و طرزِ سخن کے باوجود انہوں نے روایت کی پیروی نہیں کی بلکہ ان کا لفظی و معنوی سرمایہ روایتی شعری سرمائے سے بہر حال منفرد و ممتاز ہی نظر آتا ہے۔ افتخار جالب کے ہاں

لسانی تشکیلات کا عمل دورِ آخر میں بھی اسی طرح زندہ ہے جیسا کہ دورِ اوّل میں تھا مگر دورِ آخر کی نظموں میں ابہام کا پردا سرکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ابلاغ کے سوتے معنی کے نئے جزیرے آباد کرتے ہیں۔ گو کہ ان کے دورِ آخر کا کلام بھی عام قاری کے لیے بہت حد تک ادق فہم ہے مگر لسانی تشکیلات کا یہ رنگ عصری حساسیت و آگہی کے ابلاغ و ترسیل میں قدرے کم مبہم و غیر گنجلک ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے مطابق:

> ''افتخار جالب کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے اک خاص لسانی شعور کا حصول اور اِک خاص قسم کا فہم وادراک ضروری ہے۔ اس کے بعد سمجھنے اور سمجھانے کی منزل آسان ہو جاتی ہے۔''[۱]

جو اطاعت گزار ہو جائے، اس کی خوشبوئے آدمیت تباہ و برباد
بھنبھناہٹ سے کام چلتا ہے۔ مجال کیا جو درونِ آدم کا نعرہ
رزق کھانے کے بعد ہر لمحے مرگِ جرات کا ذائقہ: ترش، تلخ، شیریں فعال
راوی نے کہہ دیا ہے: تمام چہروں کے مسخ ہونے کا وقت آپہنچا
الیعذر کا چمکتا چہرہ بگڑ گیا ہے، کریہ خنزیر لگ رہا ہے
خدا گواہ، صدرِ محترم، آپ کی شباہت بدل رہی ہے
ہمیں خرابے میں چھوڑ جاتے ہو، ہائے ربّا!
ابھی خرابہ تو نامکمل ہے! گا ہے گا ہے غریب شاعر کی باؤلی چیخ سنسناتی ہے۔''[۲]

مندرجہ بالا نظم سامراجی معیشت، سیاست اور بے ضمیری و کشمکش کی ادبی صورتحال کو اک نئے تناظر میں سامنے لاتی ہے کہ جہاں قلم کی رفتار ڈالر و دینار کے ایندھن سے چلتی حق و ادراک سے نگاہیں چراتی اپنے نفس و ضمیر کا سودا بخوشی قبول کرتی ھے۔ بے ضمیر امانت داروں کا ہجوم ہوسِ زر سے اندھا، اپنے گرد دم توڑتی چیخوں اور سانسوں سے بے بہرہ لکھ لوٹ میں مصروف اعمال کے صلے میں اپنی شباہتوں کے بدلنے سے بے نیاز رقصِ ابلیس میں شامل و مگن ھے۔ عصری آشوب کا علامتی حوالہ بنتی ہوئی یہ نظم دراصل انسان کے تہذیبی، اقداری و روحانی زوال کا نقشہ غیر روایتی انداز میں سامنے لاتی ہے کہ جہاں سرکشی و بدی کی طرف کھنچتے انسان اخلاقی اور روحانی طور پر اس پستی تک آن پہنچے ہیں کہ جو انسان کی بجائے جانور کا مقدر ہے۔ افتخار جالب نے لسانی تشکیلات کے عمل میں لسان و موضوع کو محض بے ہنگم توڑ پھوڑ اور ہنگامے کے سپرد نہیں کیا بلکہ ایک نظریہ ساز شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری کو پرکھا اور پھر اس سے برآمد ہونے والے نظری مباحث کی روشنی میں اپنے معاصر مشرقی و مغربی ادب کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کی نظمیں سامراجی سیاست و طبقاتی نظام، ملکی و غیر ملکی سیاسی و سماجی صورتحال، بالخصوص ملکی سطح پر ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ،

آمریت، کشمیر اور مشرقی پاکستان کی صورتحال کے تناظر میں بلیغ استعاروں میں ڈھل کے نئے آہنگ کو فروغ دیتی ہے، جو معاصر و ماقبل کے شعری سرمائے سے یکسر مختلف ہے۔ اپنے اچھوتے شعری عمل کے ذریعے انہوں نے معاصر عہد کے فرد کی غیر انسانی صورتحال کو تماتر پیچیدگی، بے معنویت، غلاظت و حیوانیت کے اس ماحول سمیت منعکس کیا ہے کہ جس میں وہ فرد زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مہیب و گھناؤنے معاشرتی اعمال کو لفظوں کے ریشمی لچھوں میں لپیٹنے یا ملمع سازی کی کوشش نہیں کی بلکہ مسائل و معاملات کی شدت اور اس میں پنپتی انسانی اذیت کو واشگاف و موزوں الفاظ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ذہن مسائل کے محور سے ہٹنے کی بجائے مکمل طور پر حساسیت کے حصار میں گھرا رہتا ہے۔ انہیں جس طرح عزتیں ارزاں و پامال نظر آئیں، دن لوٹ لکھ لوٹ کے ہنگام دکھائی دیئے، امرا کے جلسوں میں رقص و سرود اور جسموں کے بازار سجے دکھائی دیئے، زمانے کی ہوا پلٹتی محسوس ہوئی یا مستقبل میں کسی سہانے خواب کے شہپر سر سے سرسراتے گزرے انہوں نے بلاواسطہ و براہِ راست دونوں طرح سے اُسے قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کی۔ بقول ڈاکٹر سعادت سعید:

> ''بنگال کی تحریک کو وہ محض گھیراؤ کی تحریک نہیں کہتے۔ تنظیم کے افلاک میں کوندے کی لکیر جانتے ہیں۔ وقت کی یلغار شقی القلب درندوں کے لیے موت کا پیغام ہے۔ انہیں جبر کی عیاشی سے مخمور شیطانوں کا خاتمہ کچھ زیادہ دور نہیں لگتا۔ جہاں محنتی ہاتھوں کا راہنما معلوم ہوتا ہے۔''[۳]

> '' ہر ہوسناک بہیمانہ شہنشاہی کے دن لدنے کو ہیں
> ہر اولاامر کو مژدہ ہو کہ قہاری کے دن تھوڑے ہیں سر کچلیں گے
> چوراہوں میں لٹکائیں گے خوش بختی کے ان غاصبوں کو پوچھیں گے کس منہ سے غریبوں کے جلوسوں کی قیادت کو نکل آئے تھے؟ ہاں فکر نہیں سارے لعینوں کی زبان گدّی سے کھچ جانے کو ہے۔''[۴]

مندرجہ بالا نظمیں اس عصری حسیّت اور سماجی دردمندی کو بھی نشان زد کرتی ہیں کہ جن کی عدم دستیابی کی بنا پر نئے شاعر کو فراری، انسانیت سے غیر وابستہ اپنے لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھویا، اپنے گرد سفر کرتے زمانے کے مصائب سے بے بہرہ خود غرض انسان گردانا جاتا تھا۔ افتخار جالب کے ہاں عصری حسیّت و سماجی دردمندی بدرجہ اُتم موجود ہے مگر اس کا انداز کچھ نرالا ہے۔ اور یہ نرالا انداز جیمز جوائس کے تتبع میں ''لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر'' میں اپنی انتہاؤں پہ نظر آتا ہے۔ ''یہی ہے میرا لحن'' کی نظموں تک ایک نیا رنگ اختیار کرنے والی لسانی تشکیلات کی ابتدا ''ماخذ'' سے ہوئی۔ ماخذ ۳۶ نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے جس میں اردو شاعری کے روایتی اسلوبِ شعر سے انحراف و تصادم اور اک تازہ رنگ شعری عمل کی کاوش کے لیے تجربے کا اجتہاد متنوع اشکال میں نظر آتا ہے۔

ماخذ سے فروغ پانے والا لسانی تشکیلات کا عمل انفرادیت و اجتہاد سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی کے بقول: ''وہ مروجہ جذباتی و لسانی اسالیب کو مسمار کرنے کے لیے بڑی شدت سے روایت اور عدم روایت سے دست و گریبان نظر آتا ہے۔ اس نے نئے شعری اسلوب کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے شعری زبان اور تخلیقی عمل کے خطرناک حد تک تجربات کیے ہیں۔ اس اعتبار سے ''ماخذ'' کی حیثیت اردو شاعری کی روایت میں تجرباتی ہے۔''[۵] ماخذ کا دیباچہ لسانی تشکیلات کے جواز کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جس میں افتخار جالب نے ہم عصر اور ماقبل کی شعری روایت و اسالیب کے رسمی ادراک سے آگے بڑھ کے شاعری کو اک نئے انداز سے مدون کرنے کی نظری بنیاد فراہم کی ہے۔

ماخذ کا دیباچہ نئی شاعری کو بنیاد ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ ادبی و شعری ایوانوں میں وہ ہلچل پیدا کرتا ہے کہ جس کا تحرک ابھی تک فعال ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری کی طرح ماخذ کا دیباچہ بھی اس حوالے سے بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ اس دیباچے کے بعد اردو ادب میں دو تنقیدی گروہ ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے قدیم و جدید اور روایتی و غیر روایتی کی واضح حد بندی کر دی—افتخار جالب کے نزدیک ہمارا اندازِ زیست بدل چکا ہے۔ سماجی، سیاسی اور علمی مسائل کے تغیر و تبدل نے جذبات و احساسات کو بھی تبدیلیوں سے دوچار کر کے محبت و نفرت کے مفاہیم کو بھی نئے تناظر عطا کیے ہیں افتخار جالب کے مطابق:

> ''سیاسی، سماجی اور علمی مسائل نے ہمارے اعتقادات بدل دیتے ہیں۔ کیا ہماری محبت اور نفرت کے رشتے اور مفاہیم آج بعینہٖ وہی ہیں جو پہلے تھے۔ ہر گز نہیں۔''[۶]

ان کے الفاظ میں ''لسانی حرمتیں ایک اسلوب زیست سے جنم لیتی ہیں اور اسلوب زیست سماجی مفاہمتوں، لسانی تعینات اور لسانی عادات کو ایک وحدت دیتا ہے۔ چونکہ یہ تمام عناصر ایک بحران کا شکار ہیں۔ اس لیے ان کے پس پردہ اسلوب زیست اور اس کے حوالے سے لسانی حرمتیں اکھڑ چکی ہیں۔ انہیں چیلنج کرنے کی بجائے ردّ کرنا چاہیئے کہ یہ حرمتیں نام نہاد ہیں۔ عملاً ان کی کوئی حیثیت نہیں یہ لڑھکتی ہوئی روکاوٹیں ہیں ہماری ذات کو گرفت میں لینے والی قوتیں نہیں۔''[۷] لسانی تشکیلات کے لیے اگلا جواز فراہم کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> '' شعری مواد کے ابلاغ کے وسائل تجزیاتی نہیں۔ تجزیہ اپنی حقیقت میں چند اصولوں اور مفروضوں کو صحیح مان کر ان کے مطابق مواد کے حصّے کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو قائم کر کے ان کے قدر مشترک دریافت کرتا ہے، انہیں ربط دیتا ہے اور منظم کرتا ہے۔ یہ ترتیب جاری رہتی ہے تاآنکہ منظم فکری نظام مرتب ہو جاتا ہے۔''[۸]

جبکہ

''شعری مواد اور معانی ایک ہیں۔ اس لئے شعری مواد کو خارجی دنیا کا پرتو قرار دینا غلط اور خارجی دنیا کی عکاسی کو ادب کا مقصد بنانا بے معنی ہے کہ شعری مواد قائم بالذات شعبہ ہے، ذریعہءِ اظہار نہیں۔''[۹]

چنانچہ افتخار جالب نے لسانی تشکیلات کے دائرہ عمل سے باہر شعری و لسانی رویوں پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ :

''بعینہٖ ترسیل کا فریضہ قواعد و منطق کے زیرِ اثر لکھی ہوئی چیزیں بطریقِ احسن پورا کر سکتی ہیں کہ ان میں ترتیب، تدوین اور تجزیہ کے تمام عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ایک حل یہ بھی ہے کہ آپ شعر و ادب کو چھوڑ کر قواعد اور منطق اپنا لیں۔ خیال جذبہ یا ذہنی اندوختہ بعینہٖ قاری تک پہنچتا رہے گا۔ نامیاتی حس و حرکت کی خواہش البتہ ترک کرنا ہو گی۔''[۱۰]

افتخار جالب کے مطابق:

''تخلیقی، تازہ، ہزار شیوہ لسانی رابطوں کے خلاف ابہام کے نعرے لگانے والے انہیں یک جہتی افادیت کی سطح پر لا کر بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں۔ اس صورتحال سے عہدہ برا ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اولاً سکہ بند زبان سے اجتناب کیا جائے۔ زبان کے سکہ بند ہو جانے کے معنی ایک وقت میں دریافت شدہ لسانی رابطوں پر قناعت کرنے اور بڑھتی پھلتی پھیلتی زندگی سے تعلق منقطع کرنے کی ہیں۔ ثانیاً یہ کہ سکّہ بند زبان پر تشدد کیا جائے اور یک جہتی الفاظ کی جگہ تخلیقی ہزار شیوہ، گنجلک لسانی رابطے کام میں لائے جائیں۔ یعنی لسانی حرمتوں کو چیلنج کیا جائے۔''[۱۱]

اس تمام ترجہد کا مقصد اِک نئے شعری رویے و محاورے کی بازیافت تھی کہ جو نئے اسلوب زیست کی شناخت و تفہیم کے لیے معاون ثابت ہو سکے۔ یہ شعری محاورہ وہ لسانی تشکیلات تھیں جنہوں نے ماضی کی شعری و فنّی روایت سے منہ موڑ کر نئے لسانی مرکبات کی تشکیل کی ابتدا کی کیونکہ جدید اسلوب حیات سے آگاہی نئے لسانی مرکبات کی تشکیل اور نئے سیاق و سباق کی تعمیر کے بنا ناممکن تھی۔ چنانچہ اس تمام تر صورتحال کے تناظر میں یہ ضروری ٹھہرا کہ لسانی تشکیلات کے تحت گنجلک لسانی رابطے فعال ہوں۔ ان لسانی رابطوں کی فعالیت اِک نئے طرزِ حیات سے جنم لیتی ہے پھر ان تجربات کی شناخت نئے لسانی رابطوں کی صورت ممکن ہوتی ہے۔ لسانی تشکیلات کے تحت شاعری میں افہام کے تجزیاتی وسائل سے انحراف اور مروجہ شعری زبان پر تشدد کر کے پرانی لسانی حرمتوں کی شکست و ریخت ضروری ہے۔ لسانی تشکیلات کے پورے عمل کا خلاصہ افتخار جالب کے مضمون ''لسانی تشکیلات'' ''مشمولہ نئی شاعری: تنقیدی مطالعہ'' میں موجود ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ ''مآخذ'' کی ۳۶ نظمیں لسانی تشکیلات کا عملی اظہار ہیں جن میں ایک طرف تجربے کی شناخت نئے لسانی روابط کی مرہون منت اور افہام کے تجزیاتی وسائل سے ماورا ہے۔ دوسری طرف یہ نظمیں مروجہ لسانی حرمتوں کی شکست و ریخت اور شعری زبان پر

تشدد کے بعد اِک نئی زبان کے ظہور کی بنیادی کڑی ہیں۔ افتخار جالب کی یہ نظمیں ''لسانی تشکیلات'' کے نظریات کے تحت ایک خاص تنظیم و منصوبہ بندی کو آشکار کرتی ہیں۔ اور افتخار جالب کے فکری رجحانات تنظیم، تجربہ و انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شعری مجموعے کا نام ''مآخذ'' بھی مجموعے میں موجود نظموں کے فکری و عملی دائروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ حیات انسانی کے مآخذ کا بیان عہدِ گزشتہ میں الہامی اور مذہبی تصانیف کا حصّہ رہا ہے۔ عہدِ حاضر میں حیات انسانی کے مآخذ کی جستجو تجزیاتی اور سائنسی طریقے سے کی گئی ہے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں حیات انسانی کے مآخذ کا مسئلہ اعتقادی اور عقلی اعتبار سے اہم رہا ہے۔ ''مآخذ'' میں افتخار جالب نے لسانی تشکیلات کے تحت حیات انسانی کے مآخذ کی جویائی کے لیے دونوں طرح سے استفادہ کیا ہے۔ ان نظموں میں لسانی تشکیلات کی فعالیت عقلی وجذباتی رویوں کے اتصال اور ادراک کے ساتھ اِک نئی شعری روایت کی بنیاد رکھنے کی کوشش میں پیہم مصروف نظر آتی ہے۔ افتخار جالب نے اپنے عہد کے بحرانی دور میں انسانی زندگی کے مآخذ پہ اعتقادی وجذباتی ہر دو حوالوں سے تفکر کیا ہے اور اس مآخذ کی تلاش میں عقیدہ کی بجائے جذبات کو اپنا رہنما جانا ہے۔ اور اس طرح جذباتی ادراک کی معنویت کو عہدِ موجود سے ملحق کر کے بشر کو اس کے ماضی وحال دونوں سے آگاہی بخشی ہے۔

شفاخانۂ جستجو کالی سڑکوں پہ روشن ستاروں کی زہریلی آنکھوں کی دہشت میں جکڑا ہوا ہے
مریض اور مرض اور معالج پگھل پانی ہوئے کھٹالی میں ہیں
کون، کیا، کس کی تشخیص کر دے
سبھی کا بدن اور مرض اور مقام ایک ہے، لاکھ ہیں، آسماں کی نگاہیں!
نگاہوں کے آگے اجالا۔ اجالے کے چوگرد ہالہ۔ فقط ایک ہی ایک: وحدت
بکھرتی، اجڑتی، گنہگار کرتی، دوئی کی ھواؤں سے بالوں کو چھوتی
اٹے، بوالہوس روشنی سے بدن پونچھنے والے ہاتھوں میں رعشے کی بیچارگی ہے، بھنور میں
ہوا، بکھرے بالوں کو حفظِ مراتب کی ترغیب دے
آتے جاتے کرشموں کی تحصیل کشکولِ شوقِ برہنہ کا مسلک نہیں
کوئی دریا کی لہروں پہ رکتا نہیں
سنگریزوں کے پہلو چھلے جا رہے ہیں[۱۲]

افتخار جالب کی نظموں میں لفظ ''میں'' ایک ہمہ جہت فکری و شعری زاویہ بن کر ابھرا ہے۔ ان کی نظموں کا ابلاغ و افہام بھی اسی ''میں'' کا دریوزہ گر ہے، سرسری نگاہ سے دیکھیں تو ''میں'' شاعر کے ذاتی تجربات کے ادراک واظہار میں صیغہءِ متکلم بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ جو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ شاید شاعر خود مرکزیت

کا شکار ہو کر محض اپنے ذاتی احساسات و جذبات کو بیان کر رہا ہے اور تمام نظموں کا منبع و مصدر شاعر کی ذات ہے۔ مگر شعری حقیقت اس سے وسیع تر ہے۔ فنی تشکیل کے عمل میں ''میں'' محض ذات کا استعارہ نہیں بلکہ متنوع شعری جہات و امکانات کی کلید ہے۔ ''میں'' روشنی، انا، حرکت، حرارت، وجود، حقیقت، احساسِ ذات اور ایک مخصوص عصری و زمانی شعور کے متنوع معانی میں اپنی تفہیم و تشریح کرواتا ہے—— یہ ''میں'' محض ''میں'' نہیں بلکہ اس میں ''تو'' کا صیغہ بھی شامل ہے۔ اور ''میں اور تو'' کا یہ ملاپ ایک ہی وقت میں انسانی حقیقت کے معروضی و شعوری حقائق کی موجودگی کا اظہار ہے۔ جبکہ اپنی تکمیلی اور جامع صورت میں یہی ''میں'' بدلتے ہوئے زمانی شعور کی صورت فنی اظہار میں جابجا جھلک دکھلاتا ہے۔ لفظ ''میں'' عربی و فارسی شعر و ادب میں بھی مقبول ترین شعری وسیلہ رہا ہے جسے صوفیا نے تسلسل سے اپنی شعری کاوشوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے ہاں بھی ''میں'' تخلیقِ حیات و کائنات اور خود شاعر کی ذات کا بنیادی محور بن کر متنوع اشکال میں سامنے آیا ہے۔ افتخار جالب کی لسانی تشکیلات میں ''میں'' کا سفر تجربات اور تجزیات کی پیش کش میں مستعمل استعاروں اور کتابوں کے حوالے سے صوفیانہ تشکیلات سے مماثل ہے۔ مگر تفریق سیاق و سباق کے حوالے سے در آتی ہے۔ کیونکہ افتخار جالب کی لسانی تشکیلات میں ''میں'' کی مسافرت صوفیا کے برعکس مافوق الفطرت یا روحانی ہونے کی بجائے حیاتِ انسانی کے مادی و محسوساتی ''ماخذ'' کی جستجو میں درپیش مختلف زمانوں اور قرائن کا سفر ہے، جو بالآخر ابتدائے آفرینش تک جا پہنچا ہے۔ افتخار جالب کا طرزِ فکر و ادراک اساطیری ساخت کا حامل ہے۔ وہ اپنے عہد کے تجربات و مسائل کی جویائی کے لیے حیات انسانی کے اساطیری ماضی کی طرف قدم بڑھاتے اور مختلف فطری و بنیادی رویوں کی صداقت کو عہدِ موجود کے حقائق کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں۔ افتخار جالب کی نظمیں ماضی کی شعری روایت کو رد کر کے فکری سطح پر انسانی ماضی کو تلاشتی ہیں اور اس تلاش میں ماضی کی انسانی شخصیت کو جس انداز میں پیش کرتی ہیں وہ انداز اردو شاعری کے لیے بالکل جدا اور انوکھا محسوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عام قاری کے لیے اس کی تفہیم مشکل ہے نتیجتاً ردو منفی تنقید افتخار جالب ک فن کے لئے لازم ٹھہرتی ہے۔ افتخار جالب کے لیے ماضی ایک پر جوش و متلاطم بحرِ بیکراں ہے جسے دور سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی بجائے اس کی غواصی ضروری ہے۔ چنانچہ ماخذ حیات کی دریافت کے لیے لکھی پڑھی اور سنی سنائی باتوں پر کان دھرنا بیکار ہے بلکہ ماضی کے سمندر میں اترنا اور زندگی کے تخلیقی مظاہر کا تجربہ و مشاہدہ ذاتی سطح پر کرنا لازم ہے۔ چنانچہ تجربات و مشاہدات کی یہی گہرائی ان کی نظموں میں حیات و کائنات سے متعلق تجربات و ادراک کا اِک نیا در کھولتی ہے جس میں ''میں'' کا تصور شخصی و انفرادی انا کے حصار سے نکل کر ایک وسیع کل کو محیط ہو جاتا ہے۔ زندگی کا بنیادی جزو پانی ہے۔ اور یہی پانی حیات کا ضامن ہے۔ مذہبی و علمی حوالے سے بھی اس بات کا اظہار جابجا

موجود ہے کہ ظہورِ حیات سے پہلے کائنات سیّال صورت میں موجود تھی۔ جس نے بعد ازاں گوناگوں صورتوں میں ظہور پایا۔افتخار جالب کی لسانی تشکیلات ''دھند'' کی صورت میں اسرارِ حیات کھولتی ہیں وہ زندگی کے ابتدائی عمل کا مشاہدہ بصورت آب کرتے ہیں اور ماقبلِ حیات، موجوداتِ کائنات کو دھند میں ملفوف پاتے ہیں مگر زندگی کے جنم سے ''دھند'' جو کسی راز کی طرح کائنات کو گھیرے ہوئے تھی کئی اور رازوں میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔

''دھند''

روشن۔روشن۔روشن

آنکھیں یوں مرکوز ہوئی ہیں جیسے میں ہی میں ہوں۔۔۔۔۔مجھ میں

لاتعداد فسانے اور معنی ہیں۔ میں صدہا راز چھپائے پھرتا ہوں

میں خوش قسمت ہوں۔۔۔میرے ساتھ یہاں جہانِ رنگ و رعنائی ہے''[13]

کائنات کے دورِ اولین میں حیات نے اثبات ذات ''میں'' کی صورت کیا اور یہ ''میں'' یعنی ذات اس قدر اہم تھی کہ اس میں صدہا راز آن ٹھہرے بقول انیس ناگی'' اس وقت شعورِ ہست مخفی لفظ ''مطلق'' تھا اور جب وہ پھوٹ بہا تو' میں' سے 'تو' کی آفرینش ہوئی۔ زندگی نے 'تو' کی آفرینش تضاد اور تصادم کے لیے کی کہ اس کے امکانات ظہور پذیر ہو سکیں، شعورِ ہست نے اپنی معنویت 'پانی' کی سیال ماہیت یعنی حرکت سے حاصل کی'' چنانچہ

''میں دھرتی پہ مست خرامی کرتا

اور دریچہ بند نہاں خانوں سے روحِ یزداں کی خوشبو اٹھتی ہے

میرا سرد شام معطر کرتی ہے

اور میری تقدیر جہان خلق ہوئی ہے

جو ارماں کسی کے دل میں ہے، میں اس کی خوشبو ہوں

وامسرت کا ارض و سماں میں پھیلا نغمہ

جب محبوب تلک جا پہنچے

تو پھر میں

اور نہ شریانوں میں بہتا خون خرابہ

بلکہ لفظِ مطلق بن جاتا ہوں''[۱۴]

ہستیءِ مطلق یعنی سمندر سے قطرے کا جدا ہو کر ایک وجود و شکل میں ظاہر ہونا تا کہ وہ اس ''ہستیءِ مطلق''

کا عرفان پائے کہ جو اس قطرے یعنی فانی وجود کا منبع و مصدر ہے۔ پھر اسی ذات کی ہستی میں فنا ہو کر ''میں ناہیں سب تو'' کا آوازہ بلند کرنا اور قطرے میں سمندر اور آنکھ کے تل میں فلک کو سمیٹ لینا اسی ہستیءِ مطلق سے عشق و آگہی کا صلہ ہے کہ جب روحِ یزداں کی خوشبو روحِ خاکی کو سبک رو کر کے خوشبو میں ڈھال دیتی ہے اور اک نئے سفر کی ابتدا ہوتی ہے۔

'' میں دھرتی پر مست خرامی کرتا، اپنے من کے درد و غم میں
حیراں حیراں سوچ رہا تھا
بکھرے بکھرے جانے پہچانے انجانے چہرے
آنکھیں چوم رہے تھے
چیزوں میں کچھ روپ نہیں تھا، بیزاری تھی
قدرت کی آواز اچانک آڑے آئی اور تحیّر کے عالم میں صماً بکماً
اپنا آپ تلاش کروں''[۱۵]

پانی کا یہ سفر در حقیقت شعورِ ذات کے اثبات کی جستجو ہے۔ ابتدائے حیات میں اشیا معنویت سے تہی تھیں ہر سو تحیّر و سکوت کا عالم زمان و مکاں کی وسعتوں میں ہو نکتا تھا۔ تحیّر میں موجودات کے وجود نے تلاشِ ذات کو مہمیز کیا اور حیات لحہ بہ لحہ مسلسل بڑھوتری کے عمل سے دوچار بالآخر بصورتِ انسان ظاہر ہوئی۔ افتخار جالب کی نظموں میں ابتدا اَعناصرِ کائنات حرکت، فطرت اور ہست کے استعارے ہیں جن کی سب سے زیادہ ارفع، اور حساس شکل بصورت انسان سامنے آتی ہے۔ بشر کے روپ میں عملِ جستجو زیادہ پیچیدگی سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر افتخار جالب جستجوءِ معانی و اثباتِ حیات کے عمل میں تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک کا راستہ کھوج آتے ہیں۔ مگر انسانی زوال کے باوجود ہزیمت و شکست کو مقدر جان کر اپنی ذات کو اندھیروں کے سپرد کرنے کی بجائے انسانی کی فی الاصل ارفع ہستی اور لا محدود قوت پر اعتماد کر کے زندگی کو نئے حوصلوں کی کمک بھیجتے ہیں۔ افتخار جالب کی لسانی تشکیلات حیات کی جس حقیقت کی تشکیل کرتی ہیں ''وہ خود نگری کے داخلی عمل اور جہاں بینی کے خارجی عمل سے صورت اختیار کرتی ہے۔ یہ حقیقت کے موجودات میں شعورِ ذات کا اثبات ہے اور اسی اثبات سے ہی زندگی میں حوادث اور تصادم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت حقیقت ہے جس میں ہبوطِ آدم کا واقعہ ایک معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت میں'' میں ہوں'' ایک بہت بڑا جذباتی اور تصوراتی تجربہ ہے۔ افتخار جالب جس حقیقت کا اپنی ذات کے ذریعے دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ عدم سے ہست کا شعور ہے۔''افتخار جالب کی نظموں میں تلاشِ ذات، شعورِ ہست اور مقصدِ

حیات کی مسافرت بظاہر تو صوفیانہ اسلوبِ حیات سے مستعار ہے لیکن ان کی شاعری میں اس کا سیاق و سباق روایتی تصور سے منفرد و مختلف ہے۔ اگرچہ ان کی نظموں میں زیتون، ربّ لیالی، رجعتِ عقبیٰ، النفس، آفاق، جہنم، کن فیکون، ہفت سماوات، عقبیٰ، روحِ یزداں، کلمۃ الحق، لفظِ مطلق، تائیدِ غیبی، سدرۃ المنتہیٰ، معرفت، تحت الثریٰ، اور توبہ واستغفار وغیرہ جیسی صوفیانہ و مذہبی اصطلاحیں موجود ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ غیر مذہبی اساطیری حوالوں بھی برابر فعال ہیں۔ مذہبی و صوفیانہ علائم ورموز کے ساتھ منسلک اساطیری حوالے ایک طرف تو ان کی لسانی تشکیلات کی فعالیت کا نقشِ منفرد ہیں اور دوسری طرف یہ معنوی طور پر حیاتِ انسانی کے ماضی کے وہ بند در کھولتے ہیں جب مذاہب وادیان بھی نقشِ باطل تھے اور ان کا وجود ظاہر نہیں ہوا تھا۔— "آخذ" میں افتخار جالب کی لسانی تشکیلات فکرِ انسانی کے نقشِ اوّلیں کی صورتیں واضح کرتی ہیں اور انسانی ارتقا کی کڑیاں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی فنی جہات ابتدائے آفرینش سے عہدِ حاضر تک کے زمانی و مکانی سلسلے کو انسانی فکر وجذبات کے تحت مرتب کرتی ہیں اور عہدِ حاضر و گزشت میں اساطیر و آرکی ٹائپس کے ریشمی دھاگوں کے ذریعے ناتا استوار کرتی ہے۔ لسانی تشکیلات کے اس عمل میں بشری فکر وجذبات اور حیات انسانی کے ماخذات کے حوالے سے افتخار جالب کا رویہ کہیں تائیدِ غیبی کا ہاتھ تھامتا ہے تو کبھی موجوداتِ ہستی میں تسلسل سے جاری اصولِ زیست و تخلیق کو عقلی بنیادوں پر قبولیت بخشتا ہے۔ اس نوع کا تضاد متعدد نظموں سے ہویدا ہے جس سے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے تنقیدی نظریات میں انہوں نے جس ماضی کو کلّی طور پر ردّ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے اس سے وہ مکمل طور پر منحرف ہو نہیں پاتے۔ بلکہ ماضی کے ردّ و قبول کی آویزش سے اِک نیا راستہ تلاش کر کے اپنی راہ خود متعین کرنے کی جہد میں مصروفِ عمل ہیں۔ انہوں نے ماضی کے صوفیانہ و مذہبی علائم استعارات ورموز کو محض وراثت کے طور پر سینے سے لگانے کی بجائے خود احساسِ ماضی کا تجربہ کیا ہے۔ اسی بنا پر ان کی نظموں میں فکری اعتبار سے ہبوطِ آدم اور ابتدائے کائنات کے نیم مذہبی و سائنسی تصورات دستیاب ہیں۔ مگر "آخذ" میں لسانی تشکیلات کا عمل حیاتِ انسانی کے حوالے سے بشر کے تجربات اور واردات کا ایک مکمل و مرتب سلسلہ تشکیل دینے کی سعی کرتا نظر آتا ہے۔ جو ابتدائے حیات کے اعتقادی نظام اور اساطیری سلسلوں کے مختلف ادوار سے ہوتا ہوا عہدِ حاضر میں آن ٹھہرتا ہے جہاں جہدِ انسانی کا لامتناہی تسلسل "آخذ" کی نظموں کے تحت اپنی تصویر مکمل کرتا ہے۔

> "۔۔۔ کونسی شے متحیّر ہو گی، کون دوبارہ ملک عدم پر پردۂ موجودات چڑھائے گا
> میں کچھ نہیں کہتا، میرا مقصد پھیلاؤ سے حرفِ خفی کو جلی کرنا ہے، کوکھ میں بیج بکھیرنا
> اپنا فرض ادا کرتے ہی جل مرنا ہے۔"[۱۶]

افتخار جالب کی نظموں میں نسل انسانی کے ارتقائی سلسلے ان کے شعری و فکری ارتقا کے ساتھ ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں۔ ان کے نظامِ فکر کے ابتدائی حصّے میں تجربات کی نوعیت تصوراتی و تجریدی ہے جو ایک طرح سے شخصی و انفرادی بھی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جب حرفِ خفی کو جلی کرنے کا قصد کرتے ہیں تو ان کی نظموں میں تجربات کے نئے سلسلے آشکار ہونے لگتے ہیں۔ مگر جب وہ ماضی کے شعور و تجربات کا خزینہ سنبھالے حال میں داخل ہوتے ہیں تو حال کی زمانی و انسانی صورتحال انہیں نئے بحران و شدائد سے دوچار کرتی ہے۔ ماضی کا فکری اثاثہ حال کی ضروریات و اسالیب سے ہم آہنگ ہونے سے قاصر رہتا ہے اور حال کی مادی اقدار اور مسائل کی نوعیت شاعر کی فکری و تنظیمی وحدت کو منتشر کر ڈالتی ہے۔ چنانچہ حال کے لمحوں اور حیات کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لیے ماضی کے نظامِ اعتقاد و نظامِ زیست سے دور ہونا لازم ہو جاتا ہے۔ یہ انقطاع عہدِ موجود کی ضرورتوں اور ذاتی انتخاب کا حاصل ہے۔ مگر ماضی کا انقطاع کوئی معمولی عمل نہیں۔ بلکہ صدیوں کے اعتقادی نظام سے یک لخت دوری اس مہیب تنہائی کو جنم دیتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

" ربّ لیالی! تیری ضو کی آنچ نرالی
تجھ بن ویرانے میں ازلاں والی تاریکی، تنہائی
میں؟ میرا کوئی انت نہیں ہے
اپنی وسعت میں گم ہو کر راہ بھلائی، آنچ گنوالی
میرا قدم رنجہ کا طالب سایہ سوکھ گیا
میں کھوتے کھوتے حیرت خیز تعاقب میں نکلا
آج مجھے معلوم ہوا ہے
بھول مری تقدیر ہوتی ہے"[۱۷]

مذہبی اقدار و مابعد تصور سے علیحدگی کا عمل جس تنہائی اور ویرانی کو پیدا کرتا ہے ان کا فنی عمل اس کی رمزیت کو بدل کر اسے فرد سے اجتماع تک لے جاتا ہے۔ اور صدیوں کے منظم اقداری نظام کی عمارت جب زمین بوس ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ انفرادی و اجتماعی طور پر بے بسی، بے کسی، معاشرتی حیات میں اقدار کے تذبذب اور مستقبل کی تاریکی کی صورت میں سامنے آتا ہے:

"تغیر تبدّل کی موجیں لپکتی ہیں
فقروں میں تعبیر کی معذرت ہو تو ہو، اور کچھ بھی نہیں
مجھ کو تاریک دیوار ٹھنڈی عقوبت کے سائے میں تحلیل کرتی ہے

میں چیختا ہوں
بتاؤ بتاؤ مرے خواب کس کھیت میں دفن ہیں
میں نہیں جانتا۔ موت کھیتوں میں اُگتی نہیں ہے
شبیہوں کا پگھلاؤ: پرھول، سحر آفریں۔ آدمی کی وراثت۔ نیا آئینہ۔ اُسکی
آنکھیں اکیلے میں پتھرا گئیں۔ نیلے صحرا میں شاداب سورج ستارے کنول
میری ہستی کے تاریک خوابوں میں دیوانگی، شعلے، پگھلاؤ''[۱۸]

انیس ناگی کے بقول:

''افتخار جالب جب ماضی سے علیحدگی اختیار کرنے لگتا ہے تو اس کے مسائل اور تجربات کی نوعیت بدلنے لگتی ہے۔ ماضی کے تجربات میں سے گزر کر اس سے علیحدگی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر شاعر جس زمانے سے روبرو ہے اس کے استفسارات کی نوعیت ماضی سے اس کی وابستگی منقطع کر دیتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو ماضی کے اساطیری صداقتوں پر یقین رکھتا ہو جب اس کا سامنا ایسے زمانے سے ہو جو بے ترتیب اور بے ہیئت ہے، اس کے یہاں تنہائی اور تنہائی سے پیدا شدہ وحشت کا در آنا ضروری ہے۔''[۱۹]

اسی بنا پر افتخار جالب کا اپنے عہد کے حقائق اور زوال پذیر اقدار سے برتاؤ تلخی و ترشی کا مظہر ہے۔ زمانے کی ہوا انسانی منافقت اور معاشرتی ناانصافی سے اس قدر مملو ہے کہ بشر کا بشر سے رابطہ محال ہے۔ افتخار جالب کی نظمیں اسی تنہائی و انتشار کی کیفیات کے تحت ہمعصر صورتحال سے رابطہ استوار کرتی ہیں اور انسانی حیات کے مآخذ اور بشری جستجو کی مابعد الطبیاتی و مذہبی صداقتوں کی کھوج میں نکلنے کی بجائے اِک نئی جدوجہد کی طرف قدم بڑھاتی ہیں۔

''میں اوہام پرست نہیں ہوں
ہفت سماوات اور زمیں گردش میں قید ہوئے
سارے تعلق ٹوٹ گئے
مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟ میں ہر راز بیاں کرنے سے عاجز ہوں
میرے پاس کسی کا نام نہیں ہے
میرے کان حقیقت کی آواز نہیں سنتے
شک، سرگوشیوں کے نقارے میں
استفسار ہی استفسار جواب نہیں''[۲۰]

مندرجہ بالا نظم نئی شاعری کے مسائل کے تعین کی اہم کڑی ہے۔ جہاں ماضی کی فراموشی و حال کی بے

تسکین پذیر ائی آنے والے عہد کا نقش مرتب کرتی ہے۔ افتخار جالب ماضی کی وراثتی حقیقتوں اور صداقتوں کی صدا سننے سے انکاری ہیں۔ وہ کسی مروّجہ حوالے یا سند کو مسائل کی توجیح کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ نہیں اور رموزِ حیات کو بھی بیان کرنے سے عاجز ہیں کیونکہ عہدِ حاضر کے جن لمحوں میں وہ جی رہے ہیں، ان میں حوالوں کی تعبیر کا انداز مختلف ہے۔ استفسار اور اس کا جواب دینے کے لیے، ہیکلی قوت درکار ہے، جو موجود نہیں۔ ایسے میں جوابات کی عدم موجودگی وحشت و تشدد کی ان کیفیات کو جنم دیتی ہے جو ان کی لسانی تشکیلات کا امتیازی نشان بن جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود افتخار جالب کا ذہن محض تشدد و بے ہیئتی کو قبول کرنے کی بجائے اپنے تجربے اور سوچ کا انداز خود متعین کرتا ہے اور وہ کہتے ہیں:

" تجزیہ اور تجرید میرے لیے زادِ راہ ہے
میں تشکیک و تقدیر کی سرزمین کا عجیب رکھ رکھاؤ سے جغرافیہ لکھ رہا ہوں۔"[۲۱]

ان کی نظمیں فکری خود اعتمادی کا گہرا نقش لئے ہوئے ہیں۔ شاعر کو یقین ہے کہ وہ زندگی کے جن نئے مآخذات کی تلاش میں ہے وہ عہدِ موجود کے اسلوبِ حیات کے حقیقی ترجمان ہیں۔ چنانچہ یہ خود اعتمادی کچھ اس انداز سے اپنا اظہار کرتی ہے:

" میں اصطلاحات کی نئی کونپلوں کی خوشبو کو سونگھتا ہوں
عجیب قصّہ ہے
کوئی آوازۂ سحر تاب سن سکے تو

میں شورِ شہر بدن میں ڈوبا ہوا پرندہ ہوں
بعد مدت کے وقت سطحِ خیال پر کھینچ لایا ہے
دن بدن بدلتی مہیب ہوتی حقیقتیں دائرے کی گردش میں آ گئیں
میں زندگانی کے خوشنما پیرہن کو خاکستری ارادوں کے ہاتھ میں دے چکا ہوں"[۲۲]

افتخار جالب نے لسانی تشکیلات کے نظریئے میں منطقی اثباتیت پسندوں سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ لسانی تشکیلات کے نظری مباحث میں ان کے متعدد حوالے سامنے آتے ہیں۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ افتخار جالب منطقی اثباتیت پسندوں سے متاثر تو تھے مگر منطقی اثباتیت کے فلسفے کو پوری طرح سمجھنے اور شعری عمل میں اسے برتنے میں ناکام رہے۔ لسانی تشکیلات کے عمل میں افتخار جالب کی نظموں میں اصطلاحات کی نئی کونپلوں کا علم منطقی اثباتیت

پسندوں کی دین ہے۔انیس ناگی کے بقول:

''افتخار جالب منطقی اثباتیت پسندوں کی طرح اصطلاحات کی نئی کونپلوں کو 'علم' کا ذریعہ بناتا ہے۔ چنانچہ اس تصور کے ساتھ ہی اس کا حقیقت کا تصور بھی بدل جاتا ہے۔ وہ زندگی کا باطن روحانی واردات میں تلاش کرنے کی بجائے حقیقت کے مادی تصور کی تشکیل کرتا ہے۔''[۲۳]

حقیقت کے مادی تصور کی تشکیل کے لیے افتخار جالب لسانی تشکیلات کے عمل میں غیر مادی عناصرِ ترکیبی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور حیات کے اصولِ تغیر کو قبول کرتے ہوئے ماضی کے کھنڈر سے پھوٹتی نئی کونپلوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

''کونپل کھنڈر کے انبار سے پھوٹنے کو ہے۔ دیکھو تو دیکھو پھوٹ آئی ہے!
تم بہت خوبرو ہو! زمانے کی چلمن گرادو۔ مرا رابطہ مشفقانہ نہیں ہے۔ ہاں
مجھے بابِ وحشت سے درآنے دو۔ میں بہیمانہ تندی کا پیکر ہوں۔۔۔ مرے
ہاتھ پاؤں کی مٹی ازل سے ابد تک پراسرار مقصودِ بالذات۔ ''[۲۴]

چنانچہ ان کے فکری عمل میں انسان کا مادی جسم مقصودِ بالذات حقیقت ہے جو مابعد الطبیعیاتی نظامِ حیات کی تردید کرتا ہے۔ لسانی تشکیلات کے تحت مادیت قائم بذات حقیقت ہے اور اسی لئے انسان اور اس کی جدوجہد بھی قائم باالذات حقیقت ہے جو اپنے اعمال سے زمانے کی گرد جھاڑ کر نئے عہد سے روبرو ہوتا ہے۔ حقیقت کی مادی تشکیل کا عمل پُر صعوبت ہے جس میں اقدار کا تصادم، ناانصافی و تشدد کے ہنگامے میں جذباتی رشتوں کے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں اور زمانہ تسخیرِ آرزو کے لیے تشدّد کا ہتھیار بے دریغ استعمال کر رہا ہے۔ مگر افتخار جالب کی لسانی تشکیلات جہاں تشدد میں غلطاں اس حقیقت کی تشکیل کرنا چاہتی ہیں کہ جو سلطانِ تغیر سے خوفزدہ ہو کر کہیں جا چھپی ہے وہیں وہ عصرِ جدید کی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی زندہ رکھتی ہیں۔ اسی بنا پر افتخار جالب زمانے کے شدائد کو بے جگری سے جھیلتا، تجارتی منڈیوں کی نفسا نفسی کو چیرتا، قربان کرنے اور قربان ہونے کے عمل سے گزرتا، رگ و پے کے زخموں کی چبھن کو سہتا حوصلے کے اس مقام پر آ ٹھہرتا ہے کہ جہاں حقیقت کا اثبات اٹھتے اور آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک کر اپنے نظریات و انفرادی شناخت کے محلوں کو مسمار کر کے ایک لمحے کے لیے پلٹ جانے کی تمنا بھی کرتا ہے، مڑ کر دیکھتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ واپس پلٹنے کا حاصل شاید لاحاصلی ہو، مگر زمانے کے شدائد کا حل واپسی میں ہی ممکن نظر آتا ہے۔

'' آؤ دھندلے زمانے کی تمثیلِ مادیت واقعاتِ آفرینش میں ڈھونڈیں

آؤ کوشش تو کریں۔''[۲۵]

افتخار جالب کی لسانی تشکیلات کا سفر ''مآخذ'' میں اساطیری ذہنی رجحان کے باوجود عصری شعور کا حامل ہے۔ عصر حاضر میں زندگی کا قرینہ جن ہیئتوں میں ڈھل رہا ہے وہ اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ چنانچہ مآخذ میں ایسی جذباتی ہیئتوں کے تشکیلی ہیولے بکھرے ہوئے ہیں کہ جن سے عہدِ حاضر کے اسلوبِ زیست کی شکل متعین ہو سکے۔ افتخار جالب نے فلسفے کو تلقین غزالی کا وسیلہ بنانے سے زیادہ اپنی صورتحال کی تفہیم کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کی نظمیں درد و کرب کے احوال کا سامنے کرتے کرداروں اور ان کے وجودی رویوں اور کیفیتوں کے دروبست پر مشتمل اردو اور فارسی زبان کی وسعتوں سے واقف قارئین کے لیے مشکل نہیں ہیں۔ اس تناظر میں ابلاغ کا مسئلہ ان قارئین کو درپیش ہے جن کے لئے از خود زبان بھی ایک مسئلہ ہے یا وہ اس کے سماجی، فکری، نفسیاتی، اساطیری اور صوفیائی مستعملات سے بے خبر و ناواقف ہیں۔[۲۶] لسانی تشکیلات کی فعالیت میں ''لسانی تشکیلات و قدیم بنجر'' نئی تنقید و شاعری کا امتیازی نشان ہے کہ جس میں بقول ڈاکٹر سعادت سعید: افتخار جالب نے پہلے شعری مجموعے ''مآخذ''اور طویل نظم ''قدیم بنجر''میں ارادتاً مستعمل لسانی نوادرات کو جوازنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک ''مآخذ'' اور ''لسانی تشکیلات و قدیم بنجر'' بیانیاتی قوت کے تکثیری و تقلیلی مظاہر ہیں:

''جست جو کے تمام کرب و بلا کی ہیہات
اختلاط ممسک غبارِ تنہائی دشتِ بے چارگی سے محدود خوں گھلاتی
گزرگاہوں کی چھپی کراسنگ
آہ، مردود کو، کب اثبات مشتمل بر سفید یخ بستہ جُھرجُھری خوف
زنگ آلود بے اماں گردشوں کی پرہول لپٹی لذت
عجائبات آبرو بہاراں کے دیکھیے
انگبیں عداوت زوال شب حرف زن مقامات
مستند محل نظر فسادات مرمریں دائروں میں خم ٹھونکتے، تنومند کھیتیاں
دھول؛ سینچتے؛ طیش الو کے پٹھے کتے کمینے؛ منہ پر وفا ذلت
قفا، دفع دور؛ ذم ذنب قہر عیش کھاتے
ملامتیں کھولتے
پرانے جہان کی خواب ناک گدلاہٹوں میں وقفے مداخلت کا مدار ٹیڑھا
سکوت خواہش کو ہولے ہولے فساد تلچھٹ

مذاق توہین کے تحیّر زدہ تمسخر کے ولولے

چھیڑ چھاڑ؛ پرہیز لازمی ہے

قدم سے قدم ملائے مہک مزاج مونولتھک حجابات اندھے "[۲۷]

مندرجہ بالا نظم لسانی تشکیلات کے اس غیر روایتی، غیر جذباتی محاورے اور لغاتی پابندیوں سے ماورا ہونے کی اک چھوٹی سی مثال ہے کہ جہاں پر نامانوس سماجی حالات، نفسیاتی الجھنوں اور بشری کرب ولاحاصلی کا بیان روایتی اسالیب میں ممکن نہیں۔ اور اگر یہ کوشش کی جائے تو موضوع صیغۂ اظہار کی عدم مطابقت کے باعث بہت دور جا پڑے گا۔ چناچہ افتخار جالب نے اجنبی اور مجبور و مقید ماحول کی وحشتوں کو برہمی، افسردگی اور بے یقینی کے سانچوں میں اک نئی اور بے کشش لغت اور شعری محاورے میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ جبر کے اس لسانی اور سماجی ماحول میں جب وہ بشر یا خود کو آرزؤں اور تمناؤں سے تہی پاتے ھیں تو اس مغلوبیت سے دوری کے لئے آزادی بلکہ بغاوت کی طرف رجوع کرتے ہیں، چناچہ اشتعال، نفرت، جھنجھلاہٹ، عدمِ تسکین اور جذباتی شدت آزاد ادراک، لسان اور اسلوب کی طرف رجوع کرتے ہیں جہاں بسا اوقات لایعنیت ماحول کی بے معنویت کہ زبان دینے کا وسیلہ بن جاتی ہے تاکہ خارج میں موجود تعفن اور جبر اپنی اصل صورت میں ظہور پاسکے۔ افتخار جالب کا بیشتر فن انہی بے کشش لسانی جدتوں کا امین ہے کہ جہاں ابلاغ کے مروجہ اصول بے عمل ہو جاتے ہیں اور شاعر کی انفرادی تشکیل و توضیح تک پہنچنا عام قاری کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ افتخار جالب کے ہاں "لسانی تشکیلات و قدیم بنجر" کی نظموں میں بالخصوص یہ کیفیت زیادہ شدید ہے کہ جہاں قدیم شعری معیارات، رسوم و روایات کی شکست وریخت میں غلطاں اک نئے شعری اسلوب کی تشکیل بھرپور صورت میں نظر آتی ہے۔ افتخار جالب کے نزدیک صیغۂ اظہار، امیجری، ہئیت اور لغت کا تعین کرتا ہے یعنی خیال و تجربہ اپنی ہئیت خود ساتھ لاتا ہے چنانچہ روایتی اور بندھے ٹکے اسالیب و قواعد کو حسبِ منشا توڑا مروڑا جاسکتا ھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی تخلیقی واردات جس نوع کے امکانات کا حاصل ہے اسے روایتی طرزِ شعر کے ذریعے پیش نہیں کیا جاسکتا چنانچہ انہوں نے اپنے اظہار کے لیے نیا لسانی پیرائیہ اختیار کیا۔ جس کی پیروی مشکل تھی۔ افتخار جالب کی تمام نظمیں ایک منظم فکری تنظیم کی پیداوار ہیں۔ اور یہ فکری تنظیم و منصوبہ بندی شاعری کی نئی لسانی تشکیل سے عبارت ہے۔ جس کے تحت انہوں نے روایتی اسلوب شعر کی ترتیبوں و نزاکتوں کو بدل دیا ہے۔ یہ تبدیلی موضوعات و تصورات سے آگے بڑھ کر الفاظ و مرکبات اور ان کی معنوی جہات تک پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ جس لسانی اسلوب کو منظم کرتے ہیں اس میں کلاسیکی تنظیم بہت حد تک قائم ہے۔ ان کی نظموں میں مصرعوں کی ترتیب، لفظوں کی نشست و برخاست کا قرینہ اِک خاص قسم کی منصوبہ بندی کا مظہر ہے۔

انہوں نے عہدِ جدید کی ہولناکیوں میں گھری انسانی شخصیت کے مؤثر بیان کے لیے جو شعری پیرائیہ لسانی تشکیلات کے روپ میں اختیار کیا وہ اپنے نوع کی منفرد اور اچھوتی مثال ہے۔ لسانی تشکیلات کے تحت ان کی مرتب کردہ نظمیں بظاہر گنجلک، مشکل اور مفہوم سے عاری نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں موضوع کے روابط و تلازمات کا طریقہءِ کار ہم عصر نظم کی روایت سے یکسر مختلف ہے۔ ان کی نظموں میں خیال و ادراک کی پیشکش لاتعداد جہات کا اشاریہ ہے۔ ان کے ہاں موضوع نہ تو کوئی مرکزی نقطہ رکھتا ہے اور نہ ہی حدود بلکہ منتشر تصویروں، بکھرے ہوئے خیالات اور ذرّہ ذرّہ اڑتے احساسات کے سیاق و سباق میں معنوی اکائی کی دریافت مشکل مگر دلچسپ عمل ہے۔ ان کی نظمیں پیچیدہ تجربے کی تنظیم و ترتیب کا منفرد عمل ہیں۔ لسانی تشکیلات کے عمل میں افتخار جالب نے کہیں بھی تلازمے، علامت اور تجرید پر کلّی انحصار نہیں کیا بلکہ ان تمام چیزوں کو کبھی اکٹھا اور کہیں انفرادی طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ان کی نظم ایک نقطے سے ابتدا کرتی ہوئی ایک فکری تسلسل کے ساتھ چلتی ہے اور پھر دو تین مصرعوں میں ہی تلازمہ نئی دنیا و تصویر کو سامنے لے آتا ہے۔ اور یہ تلازماتی تصویریں محض تصویریں نہیں رہتیں بلکہ علامتیں بھی بن جاتی ہیں اور پھر یہی علامتیں علامتوں سے ابھر کر تجریدی فعالیت میں مصروفِ عمل ہو جاتی ہیں۔ تجریدی عمل دوبارہ اپنی ابتدائی اکائی یعنی مرکز کو پلٹتا ہے یہاں تک کہ نظم کی مرکزی اکائی یعنی مرکزی خیال تک ذہنی رسائی مکمل صورت میں ممکن ہو جاتی ہے۔ لیکن روایتی اظہار اس فنّی قرینے کی تاب لانے سے قاصر ہے اسی بنا پر لسانی تشکیلات کا عمل ابہام سے مملو محسوس ہوتا ہے۔ نئے شعرا میں بالخصوص افتخار جالب نے لسانی تشکیلات کے عمل میں ابہام کو فنّی قرینے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں ابہام شاعر کی ارادی تخلیق کا مظہر ہے۔ اس کے ذریعے افتخار جالب نے نظم میں ڈرامائی تناؤ کے ساتھ ساتھ مختلف النوع تلازمات، تصورات و امکانات کو فروغ دیا ہے۔ دراصل وہ اس فنّی حقیقت سے آگاہ تھے کہ مکمل ابلاغ خیال کی قدر و قیمت کم کر دیتا ہے اسی بنا پر ان کی لسانی تشکیلات میں ابہام اور شعری تجربے کی نوعیت بہت حد تک سورئیلی فنکاروں کے تجربات سے مشابہہ ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے الفاظ میں:

> ''ان کے ہاں اشیا کی پہچان کا ریاضیاتی طریقہ بے معنی ہے۔ جدید مصوری میں بھی اشیا کی شناخت کے لئے دو اور دو چار کا طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا، افتخار جالب کی نظموں میں نفسیات، فلسفہ یا منطق کے بعض معاملات ان کے ذاتی میلانات و رجحانات، مشاہدات و تجربات میں شامل ہو کر نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ انہوں نے انسان کی صورتحال پر مختلف النوع زاویوں اور جہتوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی، فکری، جذباتی، علمی اور تحلیلی انداز ان کے ہاں کچھ اس طور سے ابھرتا ہے کہ وہ فلسفہ تاریخ یا منطق کی کہانی معلوم ہونے کی بجائے وارداتی، احساساتی اور جذباتی، پیرایۂ اظہار کی بدولت شعری

تصورات کی کامیاب تشکیل کا قائم مقام بن جاتا ہے۔''[۲۸]

افتخار جالب کی نظمیں موضوع و مواد کے تنوع کے باوصف ایک الگ و منفرد لسانی پیرائیہ تشکیل دیتی ہیں۔ان کی نظموں میں زبان اور پھر اس کا استعمال دونوں تغیر و انفرادیت کے مظہر ہیں۔ان کی لسانی تشکیلات شعری بیان کو نئے سرے سے متشکل کرنے کی کوشش میں لفظوں کے جوڑ توڑ اور ان سے نئے معانی پیدا کرنے کی کاوش میں پیہم مصروف نظر آتی ہیں۔اور سب سے اہم بات کہ ان کے مستعمل لفظوں کی حیثیت کو ان کی نظم کے مجموعی معنوی سانچوں سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ان کی نظموں میں لفظوں کی علامتی توانائی اور معانی کا اِک نیا سلسلہ دراز ملتا ہے۔ جو ذہن کے تلازماتی عمل کو تجربے کے منطقی تسلسل پر ترجیح دینے سے مرتب ہوتا ہے۔اسی بنا پر افتخار جالب کی منظومات میں فوری ابلاغ کی وہ منطقی شکل موجود نہیں جو مروجہ اسلوب شعر کی خصوصیت ہے۔بلکہ وہ لفظوں کو اشیا اور تجربات کا درجہ تفویض کر کے ان کے صفاتی دائرے تخلیق کرتے ہیں۔ان کی نظموں میں لفظوں کے باہمی روابط بنیادی، تلازماتی و تخیلاتی ہیں۔یہ لسانی سطح پر وہ متشدّد رویہ ہے جو سکہ بند زبان کے کُہن سالہ اور شکست خوردہ حصار کو توڑتا ہے۔اس کی کامیاب مثالیں مآخذ کی ابتدائی نظموں میں نظر آتی ہیں جن میں لسانی تشکیلات کا عمل روایتی شعری اسلوب سے جدا مگر ہم عصر نئے شعرا سے ہم آہنگ ہے۔لیکن 'مآخذ' کی نظموں سے ہی بتدریج نظریہ ساز کا شاعر پہ غلبہ بڑھنے لگتا ہے اور افتخار جالب کا فن تخلیقی واردات پر لسانی اجتہاد کو فوقیت دینے لگتا ہے۔چنانچہ افتخار جالب اپنے موضوعات کے شان شکوہ کو نمایاں کرنے کی غرض سے خطابت کے قریب ہو جاتے ہیں۔ عربی و فارسی لسانی مرکبات کی تشکیل عمل میں آنے لگتی ہے۔ مفرد الفاظ کے استعمال کی بجائے اضافتوں کے استعمال سے ایک ہی لفظ میں ایک سے زیادہ تصورات کا انتقال ہونے لگتا ہے،اس عمل میں الفاظ کی جسمیت و تجرید دونوں کو بیک وقت نمایاں کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ صفاتی دائرے تشکیل پانے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں کشکولِ شوقِ برہنہ، شورِ شہرِ بدن، حیات بعد از ممات کی دھندلی آگہی، حقوقِ خیر البلوغت آموختہ، ہذیان ہوشیار امتناع آوارگی۔ بحورِ پابندِ نالہءِ نے، خوفناک گھمبیر چشمِ بد دور تیرہ محبس، قلوبِ تالیف التفاتِ آرزو کا بے شوق تمتماتا بدن، معذرت کی رگوں، بہیمانہ شرارت وغیرہ جیسی تراکیب کی فراوانی نظر آتی ہے۔ کہ جن میں لفظوں کی لغوی دلالتوں پر بھروسہ کرنے کی بجائے تلازماتی عمل کے ذریعے سے لفظوں کے صفاتی دائرے خلق کیے گئے ہیں۔افتخار جالب لسانی تشکیلات کے ذریعے مجرّد سے مجرّد اور مجسم سے مجسم دائرے و زاویے تخلیق کرتے ہیں۔ لیکن یہی عمل تفہیم کی راہ میں روکاوٹ بھی بن جاتا ہے کیونکہ بسا اوقات یہ صفائی دائرے اس قدر مبہم ہو جاتے ہیں کہ معانی تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے نیز انفرادی و ذاتی تلازمات کی فعالیت معروضیت سے اپنا رشتہ منقطع کر کے ایک الگ جہانِ معانی آباد کرتی ہے جس تک

رسائی مشکلات کی نظر ہو جاتی ہے۔ افتخار جالب شاعری میں ابلاغ کے تجزیاتی وسائل کو ضروری خیال نہیں کرتے اسی بنا پر وہ تخلیقی تجربے کے ان اندرونی اجزا کو حذف کر دیتے ہیں جو عموماً تجربے کے ابلاغ کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ چونکہ ایک نئے لسانی و شعری رویے کا اوّلین نمونہ ان کی اپنی نظمیں تھیں چنانچہ انہوں نے اس نئے شعری قرینے کے تحت لفظوں کو اس قدر فعال و مکمل جانا کہ محض لفظوں کی ترتیب و حرکات سے معنی آفرینی کرنے کی کوشش کی۔ لہذا انہوں نے لسانی تشکیلات کے عمل میں لفظوں کے صفاتی دائروں پر اعتماد کر کے لسانی مرکبات کو ایک دوسرے کے روبرو کر کے معانی کے اخذ و ترسیل کی کوشش کی لیکن ان کے اس فنّی عمل میں الفاظ کے باہمی سلسلے ابلاغ و افہام سے بہت دور جا نکلے اور نظم چستیاں بن کے رہ گئی۔ افتخار جالب کی نظموں میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب بالخصوص اردو غزل کی تراکیب کی فراوانی جہاں ناقدین کے لیے نئے پن کے دعوے پر چوٹ کی راہ ہموار کرتی ہے وہی انگریزی ادب اور فلسفے کی اصطلاحات و الفاظ کا معنوی دلالتوں کے پیشِ نظر بعینہٖ استعمال بھی انہیں اسلوبیاتی بوجھل پن اور لسانی کرخنگی و بے رنگی کی بنا پر ہدف تنقید بنتا ہے مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے روایت کے کُہنہ حصار کو توڑنے کی کوشش کی۔ یہ حقیقت ہے کہ لسانی حرمتوں کو صریحاً رَدّ کرنے اور لسانی اجتہاد کے دعوے کے باوجود انہوں نے دیگر نئے شعرا کی نسبت غزل کے لسانی اسلوب کو ترجیح دی یہ صورتحال مآخذ کے حوالے سے نمایاں تر ہے۔ مگر انہوں نے مروجہ اصطلاحات و سیاق و سباق کو جدید منظر نامے کے تحت مرتب کرنے کی جو بھرپور سعی کی اس کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی اس حوالے سے انیس ناگی کا بیان اہم ہے:

> ''یہ درست ہے کہ وہ ان کے سیاق و سباق بدلنے کی کوشش کرتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مروّجہ لسانی تشکیلات کے گرد تلازماتی رشتے امتدادِ زمانہ سے اتنے محکم ہوتے ہیں کہ ان کا رنگ ناگزیر طور پر معانی کی سطح کو متاثر کرتا ہے۔ افتخار جالب کے تاریخی تجربات میں شدت، تعقل اور تصور کارفرما ہیں۔ وہ شاعری میں تصورات کی حد بندی کرتا ہے۔ محاکے اور مفروضے کو اقلیم شعر کا جزو بناتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کی شاعری کا لسانی اسلوب بھاری بھر کم محسوس ہوتا ہے۔''[۲۹]

افتخار جالب کی لسانی تشکیلات ایک طے شدہ منصوبے کے تحت جدید تر شعری رجحان متعارف کروانے کی پر زور سعی تھیں اور یہ کوشش اس قدر منفرد تھی کہ لسانی تشکیلات کی تحریک سے وابستہ دیگر شعرا کے ہاں بھی اس کی مکمل پیروی نظر نہیں آتی افتخار جالب کا لسانی اسلوب Stylized ہے۔ انہوں نے جدید شاعری کی پیروی میں لفظوں اور مصرعوں کی ترتیب و تقسیم کو اپنے شعری تجربے کا محور بنانے کی بجائے پیراگرافر کے ذریعے تجربے کے اندرونی اجزا کو ایک دوجے سے متصل کر کے جو شعری پیکر تخلیق کیے وہ نثری نظم کی ابتدا و فروغ کا باعث بنے۔ ان کی

نثری نظموں کا غالب انداز بیانیہ ہے، لیکن یہ بیان واقعاتی سے بڑھ کر استعاراتی ہے، جو احساساتی استعاروں کے ذریعے زبان میں معنی کا دہرا عمل سرانجام دیتا ہے۔ افتخار جالب کی متعدد نظموں میں تجربے کی تشکیل اساطیری حوالوں سے منسلک اِک ایسے منفرد قصّے کی صورت متحرک ہے کہ جس کی سطحیں تجربے کے ساتھ ساتھ گوناگوں شکلیں اختیار کرتی چلی جاتی ہیں۔

''پوری کی پوری آبادی جو دفن ہوئی تو۔۔۔ کہتے ہیں نبی کے پند و ہدایت
کے روغن سے لوگوں کا چراغِ عصیاں شعلۂ نو عنوان نہیں بنتا تھا۔ جیسے
بھی ہوتا، خوشبو کا جھرنا ان کے کل میں ضم ہو جاتا۔ میں نے کہا:
تم گاؤں چھوڑو۔ آنکھیں کند کرو۔ جو دیکھ نہیں سکتے ہو، اس سے
گزر کرو۔ دل معبدِ مشتِ غبار ہو نہ سکے گا۔ میری جانی پہچانی
محبوب ہوائیں کس کے لیے اب لمس کی تیرہ تار عقوبت سہتی ہیں،
تم جاؤ۔۔۔ سمندر کے ناپاک ارادے اس کو ڈھونڈ
نادانی کی مشکوک زمینیں اگنے کی شاداب تمناؤں میں پکتی تھیں۔ وہ لڑکیاں
کہنے لگیں: دنیا کے دستور مطابق کوئی مرد ہمارے پاس نہیں آئے گا۔''[۳۰]

مندرجہ بالا نظم کا ٹکڑا نثری نظم کی ہیئت میں ابہام و اہمال سے مملو علامتی پیرایۂ اظہار کے ذریعے بے ترتیب لفظوں اور نامکمل مصرعوں کے باہمی ارتباط و ملاپ سے غالب طور پر ادھ کھلے اور نیم پیدا شدہ معنی کے جو سلسلے دراز کرتا ہے وہ مستقبل میں نثری نظم کا امتیازی نشان بن کر سامنے آئے۔ مندرجہ بالا نظم گمبھیر داخلی کیفیات سے اجتماعی انکشافِ حیات کے سلسلے دراز کرتی اساطیری حقائق کا ادراک حال کے زندہ لمحوں میں کرتے ہوئے اجتماعی لاشعور کو مجسم کرتی ہے کہ جہاں اک نیا لسانی ادراک اپنے تجزیاتی حوالوں میں معاشرے کے اس حرکی وجود کو سامنے لاتا ہے کہ جو ہر دور میں فعال رہا ہے۔ اور اس کی فعالیت انسانی ربط و اتصال کی مرہونِ منت ہے اس ربط میں دراڑ اجتماعی نسلِ انسانی کے لیے خطرہ ہے۔ چنانچہ یہ وجود قدیم اظہاری علامتوں کی شکل میں حیات کو اک مکمل اکائی گردانتا ہے کہ جہاں انفرادی وجود کی بقا در حقیقت اجتماعی انسانی ذات کی بقا ہے۔ اسی لیے افتخار جالب نے انفرادی کھوج کی حیثیت کو سماجی رستاخیزی میں فطری وسیلۂ اظہار جانتے ہوئے اپنے فن کو اردو شاعری میں اک اچھوتے اظہار اور نئے رجحانات کا نقیب بنا دیا ہے۔

'' ہر گھڑی دائرے بنتے ہیں
گنجلک، سایۂ اشجار کی مانند اُداس

میں ہوں محصور، زمیں گردشِ افلاک میں ہے
کوئی مقدر کا ستارہ بھی نہیں
کون زمیں ڈھونڈے
زمیں زیرِ قدم روز گزر کرتی ہے، تنہا و خزاں ماندہ
مرا دل کہ عفونت سے سزا یافتہ بوچڑ کی دکان ہے، نہ جہاں اور جہت
منزلیں طے ہوں گی، کبھی روشنی خندۂ گل روئے دلآرام کو دھوڈالے گی
وہ رات جسے میرا بدن اپنے لیے تیر الحاف اور لہو سوچتا ہے
سوچتی رہ جائے گی"[۳۱]

لسانی تشکیلات کا عمل جب لفظ کو شیئت کا درجہ دیتا ہے تو معانی خلا میں جنم لینے کے برعکس قائم بالذات حقیقت کی صورت سامنے آتا ہے اور اظہار کی لامرکزیت سابقہ لسانی حرمتوں کی شکستہ وریخت سے علامتی و استعاراتی اظہار کی راہ ہموار کرتی ہے۔ لسانی تشکیلات کی فعالیت میں استعارہ کا متعینہ نظام درہم برہم ہوتا ہے اور اراکین استعارہ میں قریبی تعلق کی بجائے بعیدی رشتے دریافت کیے جاتے ہیں۔ اور اسی عمل سے ابہام فروغ پذیر ہوتا ہے مگر یہی ابہام لسانی تشکیلات کا نقشِ امتیاز ہے۔ ابہام جس فنّی لطافت کو مہمیز کرتا ہے وہاں ترتیب یافتہ قاری لفظی دروبست کے دائروں میں چکراتا خود کو معانی کے سمندر میں تیرتا محسوس کرتا ہے اور الفاظ معانی کا در بن جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا نظم اس کی خوبصورت مثال ہے۔ لسانی تشکیلات کے عمل میں استعارہ ٹھوس صوری تلازموں کو خلق کرتا ہے، جہاں ہر ایک کا جہانِ معانی دوسری سے الگ و منفرد ہوتا ہے۔ اس طرح استعارہ کی ٹھوس جسمیت کا عمل زبان کی استعاراتی جسمیت میں منقلب ہو کر زبان کو محض لفظی مجموعے سے باہر نکال کر زندہ حقیقت کے طور پر سامنے لاتا ہے اور زبان جو کل تک ایک جزو تھی کل بن جاتی ہے جس کے اپنے کئی اجزا ہوتے ہیں اور ہر جزو اپنی ذات میں ایک کل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اسی لسانی وسعت کو شعوری عمل کے دائرے میں لانا افتخار جالب کا خاص امتیاز ہے۔ مندرجہ بالا نظم استعاراتی طرزِ بیان اور اظہار کی لامرکزیت سے زبان میں ابھرنے والی ٹھوس جسمیت کے ذریعے الفاظ کی معنوی وسعتوں کو وسیع سے وسیع تر کرتے ہوئے عہدِ حاضر کے لاچار، تنہا، بے بس و مجبور انسان کی داخلی و خارجی قید کا احوال متعدد زاویوں سے عیاں کرتی ہے۔ احساسات و واردات کے بیان میں کفایتِ لفظی نیم پیدا شدہ معنی کے ذریعے معنویت کے لامحدود سفر کی طرف ذہن کو مہمیز کرتی ہے جہاں زمینی و آسمانی کشمکش میں محصور انسانی ذات، غموں کو جھیلنے کی بیگار میں خدا سے دور زمین و آسماں کے خلاؤں میں معلق قصاب کی بدبودار دوکان نظر آتی ہے۔ تنہائی اور

لامحدود تنہائی یہاں انسانی مقدر ہے یہ تنہائی مابعد طبیعاتی اور مذہبی تصورات سے دوری کے باعث بھی ہے اور زمانے کے سفاک عفریت کا تحفہ بھی کہ جہاں انسان ہجوم میں بھی تنہا اپنی ہی ذات کے پَرتو سے بھی خوفزدہ ہے۔ 'مآخذ' کے بعد 'لسانی تشکیلات و قدیم بنجر' اور ''یہی ہے میرا لحن'' افتخار جالب کے اچھوتے فنی قرینے کا غالب اظہار ہیں مگر ان مجموعوں میں افتخار جالب کا شیوہءِ اظہار غالب طور پر نثری نظم کی طرف راغب ہے۔ان نثری نظموں میں شاعر کے نفسی و ذاتی تجربات کی پیش کش میں انفرادی شعری قرینے، اظہار کی لامرکزیت، لفظوں کی شیئت، مروجہ شعری سیاق و سباق کے ردّ میں لفظی، لسانی، موضوعاتی نامانوسیت، رموز و اوقاف کے استعمال میں مروّجہ قواعد و ضوابط کا ردّ اور مخصوص علامات کا استعمال ان نظموں کو گنجلک پن اور اختیاری مشکل پسندی سے دوچار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ شعری فہم و شعور کا حامل قاری بھی الجھاؤ کا شکار ہوتا ہے اور تفہیم و ابلاغ کا عمل ٹھہرنے لگتا ہے۔

'لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر' میں افتخار جالب نثری نظم کے پیکر میں اک نئی لغت و زبان کی تشکیل کے ساتھ ''لاشعر'' کا تصور پیش کرتے ہیں جس کے تحت مطلق متخیلہ کی آئینہ بندی کے لیے رائج الوقت شعری قرینوں اور شعری زبان سے نجات ناگزیر ہو جاتی ہے۔ایسے میں زبان کی توڑ پھوڑ لازم ٹھہرتی ہے کیونکہ اس عمل کے بغیر ان کے لیے مروجہ مفاہیم کے دائرے سے باہر نکلنا ناممکن ہے۔اس عمل سے زبان و ادب محدود دائروں اور مخصوص خانوں سے باہر نکل کر آزادہ روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔وہ ابہام کو ابلاغ کا وسیلہ گردانتے ہوئے اچھوتے شعری و لغاتی تجربات کی طرف راغب ہوتے ہیں کہ جہاں ان کی ریاضیاتی مطالعات سے دلچسپی ادبی مفروضات کے ضمن میں ریاضیاتی اصولوں سے مستفید ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں غیر منطقی ریاضیاتی اعداد کا تقابل کسی بھی زبان کے ان الفاظ سے کہ جو خود مرکزیت کے حامل ہوتے ہیں کیا جا سکتا ہے۔ریاضی کی ابتدا بظاہر خارجی عوامل و حیات پر اعدادی تبصرے سے ہوتی ہے اور یہ تبصرہ آہستہ آہستہ معروض کی گنتی اور پیمائش سے ابتدا کرتا ایک قائم باالذات حقیقت و زبان کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ یوں ریاضیاتی زبان ایک خاص مقام یعنی فطرت، معروضی کائنات اور وجودی اثبات سے گزر کر آزاد و خود مکتفی ہو جاتی ہے اور اس کے مسائل و کلیات کی تفہیم موضوع کے داخلی رشتوں کے تحت بہت آسان ہو جاتی ہے بعینہٖ ادب کے لئے مفروضاتی امکانات کا فروغ عین ممکن ہے۔جیسے ریاضی میں تین گیندیں تین کے عدد تک اور ایک مستطیل یا چکور میدان مستطیل و چکور کے اضلاع و تصور تک رہنمائی کرتا ہے اسی طرح کسی ناول یا حکایت میں عکسِ زیست در حقیقت اپنے ابتدائی مقام سے گزر کر ادب بمعنی قائمِ باالذات حقیقت و خود مکتفی زبان تک آن پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب ادب میں کائنات کے ریاضیاتی تصور تک رسائی ممکن ہو جائے تو مواد و ہئیت کی دوئی ایک ہو کر اک خود مکتفی ابلاغ کہ فروغ دیتی ہے کہ جہاں تحلیلِ نفسی کی مریض

اور معالج والی روایتی منطق کام نہیں آتی بلکہ سب کچھ یعنی مریض، مرض اور معالج اک کٹھالی 'میں پگھل پانی' ہو جاتے ہیں۔ یعنی زبان، ہیئت اور مواد باہم آمیز ہو کر اس نقطے پر پہنچتے ہیں کہ جہاں شعر وادب کی تفہیم تجزیے، تبصرے یا لغت کی محتاجی سے دامن چھڑا ایک متحرک کل میں داخل ہوتی ہے اور رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی والی کیفیت کائناتی حقائق اور معروضی تجربات کو لطف وانبساط کے دھاروں میں آمیز کر کے تربیت یافتہ قاری کے لئے لذتِ فکر کے سامان مہیا کرتی ھے۔ جبکہ یہی نظمیں اردو شعر وادب کے عام قاری کے لیے چیستاں اور یاوہ گوئی سے زیادہ کچھ نہیں۔

'' ٹھہرو، عیاش کی خطرناک آنکھ شعشعہ لتھیڑتی: اختلاط مشغول انفعالی
دہن لعاب انکشاف اکراہ: آخری مرتبہ! یہ چھوڑو! نہیں نہیں!
نان نفقہ رشد وہدی کی بکواس میں پھنسا ٹیر اڈیلیفو گا''[۳۲]

افتخار جالب کے ہاں لاشعر کی کائنات میں روایتی سحر شکستہ پا نظر آتے ہیں اور افتخار جالب لاشعر کی حدود کو وسیع کرتے ہوئے اسے جیمز جوائس کی ''فننگز ویک'' کی غیر روایتی زبان سے ملا کر اردو شاعری کے لیے نئے افق تلاش کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔ جیمز جوائس نے لفظوں کے بطن سے روایتی معنی کے سلسلے غائب کر دیئے تھے اور ان کی جگہ مختلف ذاتی معنویتوں کو شامل کر کے ادبی قارئین کے لیے نوع دیگر کے تعبیراتی چیلنجوں کے در وا کر دیئے تھے۔ ' لاشعر' میں جس قسم کی ساحری کا دخل ہے اور وہ جس نوع کے طلسم کدوں کے در وا کرتا ہے اردو شاعری کے عمومی قارئین ان حیرت کدوں میں داخل ہونے کے لیے کسی جادوئی اسم کے منتظر ہیں۔ جزو میں کل اور کل میں کلیتیں اور کلیتوں میں کلیتیں دیکھنا فکر وخیال کی نئی شیوگیوں کی طرف اشارہ کنانی ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے مطابق طلاموس کبیر کے سجدہ گزاروں اور ان کے حاشیہ نشینوں کو دو جمع دو چار والی منطق ہی سے غرض ہے۔ جواب مضمون لکھنے والے ہر جملے میں موجود نئے مضمون کی جہت نمائی سے دانستہ گریزاں ہیں کہ یوں بہت کچھ پردہءِ اخفا میں ہی رہ جاتا ہے۔ افتخار جالب کا لاشعر کا تصور فنی حوالے سے قابل قبول ہونے کے باوجود اردو زبان میں رائج نہ ہو سکا اور نہ ہی اسے استحسان کی نگاہ سے دیکھا گیا بلکہ ان کے اس نظریہءِ فن نے نئی شاعری کی لسانی تشکیلات کے حوالے سے منفی تنقید کا در وا کر دیا۔ اظہار وعدم اظہار کا یہ امتزاج 'مآخذ' کے بعد زیادہ شدت کا حامل ہے۔ اور یہ سلسلہ 'لسانی تشکیلات و قدیم بنجر' سے آگے 'یہی ہے میرا لحن' تک دراز ہے۔ 'یہی ہے میرا لحن' کی نظمیں ایک طرف تو مروجہ اسلوب کی پیروی میں سہل نگاری کی چھب دکھلاتی ہیں جبکہ دوسری طرف یکایک ذاتی، انفرادی وغیر مانوس لسان واظہار کی بدولت اجنبیت کا پردہ اوڑھ لیتی ہیں۔ ایسے میں ابلاغ وعدم ابلاغ کی

کشمکش میں جُوجتا قاری مشکل ہی نہیں بے زاری کا شکار بھی ہوتا ہے۔

افتخار جالب کی لسانی تشکیلات مغربی، شعری، ادبی و فلسفیانہ نظریات کے تتبع میں مروجہ شعری روایت کے ردّ وانحراف کی نمایاں مثال ہیں۔ان کی نظمیں اِک نئی لسانی پیش رفت ہیں جہاں فارسی، انگریزی، سرائیکی و پنجابی الفاظ کا مروجہ ادبی زبان میں ادغام اک نئی زبان کی تشکیل کرتا ہے جو عصرِ حاضر کی لامرکزیت، انتشار اور انسانی کشمکش کو متشکل کرنے کے لیے شاعر کی مددگار بنتی ہے۔افتخار جالب لسانی تشکیلات کے تحت لاشعوری اظہار کی کاوش میں لفظوں کو ذاتی سیاق و سباق کے تناظر میں استعمال کرتے ہوئے لفظوں کے خارجی لاحقے کاٹ دیتے ہیں جس سے ان کا شعری عمل ابہام کا شکار ہوتا ہے اور شعور و لاشعور کا عدم ربط نظموں کو لامرکزیت، پیچیدگی اور عدم تفہیم سے دوچار کرتا ہے۔ان کی لسانی تشکیلات میں نئے الفاظ کی تشکیل اور لفظوں کا غیر روایتی دروبست، طویل جملوں کا عدمِ ربط، نظموں میں اظہار و عدم اظہار کا تذبذب ان کے فنّی تجربات کو تکمیل و تاثر سے محروم رکھتا ہے۔مگر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کے انوکھے شعری تجربات زبان اور اس کے عمل کو محدود دائرے سے نکال کر لامحدودیت سے ہمکنار کرتے ہیں اور روایتی اظہار میں لفظ، فعل اور معانی کا محدود عمل لفظی پیکروں، ہیولوں اور وارداتوں کی شکل میں نیم پیدا شدہ مفاہیم کے لاانتہا دروبست کھولتا ہے۔زبان کی استعاراتی جسمیت زبان کو معمولی وظیفہ سے بلند کر کے ایک زندہ حقیقت کا درجہ عطا کرتی ہے جہاں احساسات و کیفیات معنی کے محدود دائرے میں مقید رہنے کی بجائے اپنے آزادانہ عمل کے ذریعے اک نیا جہانِ فن تعمیر کرتے ہیں اور روایتی زبان غیر روایتی اظہار میں تشکیل و تقلیب کے عمل سے گزر کر اک نئی دنیا میں قدم رکھتی ہے۔اس زبان کی قبولیت و عدم قبولیت کی بحث سے بالاتر انفرادی فنّی کاوش و لسانی و اسلوبیاتی وسعتوں کے حوالے سے یہ اقدام بہر حال مستحسن ہے۔

افتخار جالب کے شعری قرینے کا غالب اظہار ان کی لسانی تشکیلات ہیں جو اپنی نوع کا ایک منفرد تجربہ تھیں کہ جس کے مداح اس کی خوبیوں میں رطب السان رہتے ہیں اور اس کے مخالف الزام تراشی اور طعنہ زنی میں مگن۔ جبکہ کچھ ناقدین نے حقیقی صورتحال کے تجزیئے میں حقائق کو پیش نظر بھی رکھا ہے۔نئی شاعری کے اہم شاعر و نظریہ ساز انیس ناگی کا کہنا ہے کہ :افتخار جالب کی ادبی و شعری حیثیت ان کے نظریاتی تضاد کے باعث متنازعہ رہی۔ ان کے مطابق ایک زمانہ تھا کہ وہ ادبی شعری ہیئتوں کو حقیقت کے ادراک کی قائم بالذات اکائیاں کہہ کر لسانی تشکیلات کے پر پیچ عمل کی موجودگی میں قاری کی ضرورت کو غیر سمجھتا تھا۔ایک زمانہ وہ ہے کہ اسے اپنے مرکب، پیچیدہ اور عجیب و غریب لسانی منصوبے میں تنہائی اور ابلاغ کا فقدان نظر آتا ہے۔افتخار جالب بتدریج اس نظریئے کی طرف مائل نظر آتا ہے کہ انسانی تجربات لسانی صورتحال کو جنم دینے کی بجائے لسانی عمل سے ماوراواقعات کی صورت

پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ لسانی تشکیلات کی وہ منصوبہ بندی جو مآخذ کی نظموں میں بڑی شدت سے نظر آتی ہے ۱۹۶۸ء میں آکر بکھر جاتی ہے۔ افتخار جالب کا نظریاتی تضاد نظریہ ساز کی سخت منصوبہ بندی اور شاعر کی آزادی کا تصادم ہے۔ مآخذ کی ابتدائی نظموں میں شاعر نظریہ ساز پر حاوی نظر آتا ہے۔ لیکن مآخذ کی آخری نظموں میں اور قدیم بنجر میں لسانی نظریہ ساز شاعر کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ افتخار جالب نے نظریاتی تضاد اور ذاتی تردید کے ذریعے اپنی ادبی حیثیت کو متنازع فیہ بنا دیا ہے۔ نظریات میں ارتقائی تغیر ذہنی ترقی کا مظہر ہوتا ہے اس کے برعکس ہر لمحے اپنے نظریات کا شد و مد سے اظہار اور پھر ان کی تردید مضحکہ خیز صورتحال کو جنم دیتی ہے۔ افتخار جالب کی نظریاتی کایا کلپ قارئین کے جذبات سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ جو ادبی اور تخلیقی دیانت کے حوالے سے یقیناً ایک اخلاقی جرم ہے۔ بہت دور کی بات نہیں کہ ۱۹۶۸ میں افتخار جالب لسانی تشکیلات کے عمل میں، ہزار شیوہ ہائے گنجلک کے ذریعے افہام کے صیغے کو شاعری سے صریحاً خارج سمجھتا تھا اور اس بات پر مصر تھا کہ اس کی لسانی تشکیلات کا اسلوب زندگی کے اسلوب سے ماخوذ ہے۔ ادب قائم بالذات حقیقت ہے۔ اس کے برعکس ۱۹۶۸ میں اسے ادب نظریاتی اظہار کا ذریعہ نظر آتا ہے۔ آجکل اس کے نزدیک نئی شاعری سامراج کی سازش ہے، اس میں بورژوا طبقے کی تنہائی اور ذہنی تھکن کا اظہار ہے۔ اس لیے نئے شاعروں کو نظریاتی حوالات میں بند کرنا ضروری ہے۔ افتخار جالب کا المیہ یہ ہے کہ پہلے اس نے قاری کو اپنی تحریروں سے مکھی کی طرح باہر نکال کر خوشی کا اظہار کیا لیکن بعد میں خوشی اس کی تلخ آزردگی کا ذریعہ بن گئی۔ اس نے شاعری کو زندگی سے اخذ کرنے کی بجائے سیاسی نظریات کے بل بوتے پر اخذ کرنے کی کوشش کی۔ اب بھی افتخار جالب اس حساس شکست کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں اور اپنے گنجلک لسانی شیوہ کے عدمِ توازن سے بے بس ہو کر استعاراتی طریقہ ادراک کو نئی شاعری کے زوال کا ذمہ دار تصور کرتا ہے۔[۳۳] اس کے برعکس ڈاکٹر سعادت سعید کا کہنا ہے کہ :

> ''لسانی تشکیلات کے نظریئے کے تحت شاعر نہ تو معاشرتی صورتحال سے اپنا رشتہ منقطع کرتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاں سماجی عمل سے گریز ہوتا ہے۔ یہ تو ایک طریقِ کار ہے کسی کیفیت یا موضوع کو اس کی جزئیات سمیت گرفت میں لانے کا لسانی تشکیلات کی حیثیت بطور ایک طریقِ کار کے ہے۔ اس طریقہ کی ضرورت نئی پیچیدہ صورتحال سے پیدا ہوتی ہے۔''[۳۴]

موافق و مخالف آرا سے قطع نظر افتخار جالب کا اچھوتا شعری احساس یعنی لسانی تشکیلات اردو شاعری کو انفرادیت اور تنوع سے دوچار کرنے کا سبب بنیں۔ گو کہ ان کی پیروی مکمل طور پر ان خطوط پر کرنا ممکن نہ تھی کہ جسے افتخار جالب کے لسانی نظریات نے متعین کیا۔ لیکن یہ ایک ایسا طریقہ کار تھا جس سے نئی شاعری کے شعرا نے اپنی

اپنی جودت طبع سے استفادہ کر کے مروّجہ لسانی و شعری عمل کو اک نئی صورت میں منقلب کرنے کی کوشش کی۔ افتخار جالب کی لسانی تشکیلات میں زبان سائنسی یا تحویلی حیثیت کے برعکس وجدانی و علامتی سطح پر استعمال ہوئی۔ جس میں فکر و جذبے کا اتصال ذہنِ انسانی کی پیچیدگیوں اور ابہام کی تہہ در تہہ پرتوں میں ملفوف نظر آیا۔ لسانی سطح پر انہوں نے عربی و فارسی سے نئے لسانی مرکبات تشکیل دینے اور مفرد کی بجائے مرکب لفظوں کے استعمال کو ترجیح دی۔ ان کی نظمیں ہیئتوں کے اچھوتے پن اور علامتی وحدت کا نمونہ بن کر سامنے آئیں۔ جہاں نظم چھوٹے چھوٹے مصرعوں سے ابتدا کر کے خیال کے تدریجی ارتقا و پھیلاؤ کے تحت بندوں اور پیرا گراف کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ ان کی لسانی تشکیلات نظموں کی صورت میں چند علامتوں پر محیط نہیں ہوتیں بلکہ ایک ایسا علامتی کل بن جاتی ہیں کہ جس کے اندر علامتوں کے متعدد جہان متحرک نظر آتے ہیں۔ افتخار جالب کی لسانی تشکیلات کا بوجھل و غیر جمالیاتی اسلوب اپنے اندر فکری و احساساتی عمق سموئے ہوئے ہے۔ انہوں نے لسانی تشکیلات کے ذریعے جدید اردو شاعری کو جدید ترین شعری معیارات سے روشناس کروانے کی بھرپور کوشش کی جس سے آنے والے وقت میں جدید شاعری بالخصوص آزاد نظم اور نثری نظم نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ ادبی و شعری حوالے سے فیض احمد فیض اور اس نوع کے دیگر شعرا کی طرح کامیابی نہ سمیٹ سکے بلکہ ان کا فن تنقید و تمسخر کی زد میں رہا لیکن اس کا سبب ان کی فنی خامیاں نہیں ہمارا بندھا ٹکا سہل پسند شعری مزاج ہے کہ جو ذہنی، فکری و جذباتی سہولت کو تیاگنے پر راضی نہیں، ایسے میں وہ شعری تخلیقات جو اپنی تفہیم و تلطف کے لئے تربیت یافتہ اور علمی و ادبی فلسفوں و جہتوں سے آگاہ قاری کی طلب کریں کس طرح قابلِ قبول ہو سکتی ہیں؟ افتخار جالب اور نئی شاعری کی تحریک اس لئے ناکام ہوئی کہ وہ ہماری سماجی سائیکی کو meet نہیں کرتی تھی وگرنہ مغرب میں جیمز جوائس اور ولیم فاکنر جیسے متعدد نام ادب میں مشکل پسندی اور اچھوتے طرزِ اظہار کے باوجود اپنی کامیابی اور پزیرائی میں بے مثال ٹھہرے ہیں۔ افتخار جالب کا شعری اثاثہ اپنے فنی پھیلاؤ میں سیر حاصل امکانات کا حامل اور ادب کے سنجیدہ قاری اور فنکار دونوں کے لیے قابلِ قبول و تقلید ہے جس سے بلواسطہ اور بلاواسطہ استفادہ کا سلسلہ آج تک جاری ہے، امید ہے کہ پڑھے لکھے اور باذوق قاریوں کی توجہ و دلچسپی انکے فن کی خفتہ تفہیم اور فنی زاویوں تک رسائی میں معاون ہو کر ادبی تاریخ میں انہیں وہ منصب ضرور عطا کرے گی کہ جو ان کے علمی و شعری مرتبے کا حق ہے۔

حوالہ جات

1۔ راقم الحروف انٹرویو از ڈاکٹر سعادت سعید، ۱۸ اگست ۲۰۱۷ء

2۔ افتخار جالب، یہی ہے میرا لحن، لاہور: ملٹی میڈیا افئیر، اشاعت اوّل جون ۲۰۰۴ء، ص ۹۶۔۹۷

3۔ ڈاکٹر سعادت سعید، نئی شاعری: ایک جدلیاتی محاکمہ، مشمولہ ''معیار ۱۰'' اسلام آباد: شعبہ اردو، کلیہ زبان و ادب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی پاکستان، ص ۱۶۱

4۔ افتخار جالب، یہی ہے میرا لحن، کراچی: فرہنگ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۳

5۔ انیس ناگی، نیا شعری افق، لاہور: جمالیات، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۷

6۔ افتخار جالب، ماخذ، لاہور: مکتبہ ادبِ جدید، سن ندارد، ص ۱۰

7۔ ایضاً، ص ۱۶

8۔ ایضاً، ص ۲۶، ۲۵

9۔ ایضاً، ص ۲۶

10۔ ایضاً، ص ۲۷

11۔ ایضاً، ص ۱۶

12۔ افتخار جالب، ماخذ، ص ۳۷

13۔ ایضاً، ص ۴۰

14۔ ایضاً، ص ۴۲

15۔ ایضاً، ص ۸۷

16۔ ایضاً، ص ۵۶

17۔ ایضاً، ص ۸۱۔۸۲

18۔ ایضاً، ص ۸۹

19۔ انیس ناگی، نیا شعری افق، ص ۱۴۷

20۔ افتخار جالب، ماخذ، ص ۷۹۔۸۰

21۔ ایضاً، ص ۸۴

22۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔۱۰۹

23۔ انیس ناگی، نیا شعری افق، ص ۱۵۰
24۔ افتخار جالب، ماخذ، ص ۱۲۰
25۔ ایضاً
26۔ سعادت سعید، نئی شاعری: ایک جدلیاتی محاکمہ، ص ۱۶۴۔۱۶۵
27۔ افتخار جالب، لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر، لاہور، فرہنگ، اشاعت اوّل ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۵۔۱۷۶
28۔ ڈاکٹر سعادت سعید، نئی شاعری: ایک جدلیاتی محاکمہ، ص ۱۴۹
29۔ انیس ناگی، نیا شعری افق، ص ۱۵۵۔۱۵۶
30۔ افتخار جالب، ماخذ، ص ۸۸۔۸۹
31۔ ایضاً، ص ۵۱
32۔ افتخار جالب، لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر، کراچی: فرہنگ، القادر پریس ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۵
33۔ انیس ناگی، افتخار جالب، لاہور: حسن پبلی کیشنز ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۔۱۸
34۔ ڈاکٹر سعادت سعید، نئی شاعری: ایک جدلیاتی محاکمہ، مشمولہ معیار، ص ۱۵۱